ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

موجودہ فساد کا ذمہ دار

''دنیا کے فساد کا ذمہ دار مذہب نہیں ہے، دنیا کا فساد یہ نہیں ہے کہ مذہب مذہب سے لڑ رہا ہے، مذہب کے مذہب سے لڑنے کا دور ختم ہوا، صدیوں پہلے ختم ہوا، آج بچارے مذہب کو کون موقع دیتا ہے کہ وہ میدان میں آئے، آج غیر مذہبی انسان غیر مذہبی انسان سے لڑ رہا ہے، آج غرض غرض سے لڑ رہی ہے، آج ہوس ہوس سے ٹکرا رہی ہے، آج شیطان شیطان سے ٹکرا رہا ہے، آج مال سے مال ٹکرا رہا ہے، آج اقتدار اقتدار سے لڑ رہا ہے، آج حکومت حکومت سے لڑ رہی ہے، آج وزارت وزارت سے لڑ رہی ہے، آج پارٹی پارٹی سے لڑ رہی ہے''۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

AUG 17

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

₹10/-

ملک کی ترقی واستحکام کی بنیاد

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

"کسی ملک کی ترقی اور استحکام اور کسی معاشرہ کے تحفظ اور اس کے باعزت زندگی گذارنے کے بہت سے سرچشمے، بہت سی شرطیں اور بہت سی علامتیں ہیں، مثلاً: کوئی ملک بڑی فوجی طاقت کا ملک ہے، کسی ملک کے پاس زندگی کے بڑے ذرائع ہیں، کسی کے پاس معدنی، حیوانی، زراعتی دولت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، کسی ملک میں جامعات کی بڑی کثرت ہے، کسی ملک کے تعلقات عظیم ترین سلطنتوں اور عظیم ترین ملکوں سے بڑے دوستانہ ہیں اور اس ملک کو ان پر بڑا اعتماد ہے، کسی ملک میں انسانی ذہانت کا بڑا ذخیرہ ہے، وہاں بہت انسانی توانائی پائی جاتی ہے، وہاں کے لوگ جسمانی طور پر بہت صحت مند ہیں، یہ سب چیزیں کسی ملک کی طاقت واستحکام اور کسی ملک کی عزت اور اس کے احترام کی علامتیں سمجھی جاتی ہیں، میں ان کا انکار نہیں کرتا، لیکن اگر میرے سامنے کسی ملک کی بڑائی، کسی ملک کے استحکام اور کسی معاشرہ کے باعزت زندگی گزارنے کا ذکر آئے اور کسی ملک کی تعریف کی جارہی ہو تو میں ایک سوال کروں گا، وہ یہ کہ "مجھے یہ بتایئے کہ وہاں کے اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلباء تک نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کس درجہ کا احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے، ان میں ضبط نفس کی کتنی طاقت ہے، ان میں اپنے تاثرات کو حد اعتدال میں رکھنے کی کتنی صلاحیت ہے، ان میں کسی ملک کے صالح نظام اور جائز قوانین کے احترام کی کتنی عادت ہے، اور ان میں احساس شہریت کتنا پایا جاتا ہے؟" میں تاریخ کے ایک طالب کی حیثیت سے اور تاریخ کے حدود سے نکل کر زندہ معاشروں میں چلنے پھرنے اور لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ایک انسان کی حیثیت سے بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، میں صرف کتابوں کے صفحات اور گزشتہ تاریخ پر اس کی بنیاد نہیں رکھتا۔

اعداد وشمار کے فن یعنی شماریات نے ہمارے اس زمانہ میں جو اہمیت اختیار کرلی ہے، اس کے لیے جو بڑے عظیم ادارے قائم ہوئے ہیں، ان کے لیے جو انسانی توانائیاں صرف ہورہی ہیں، ان کی اہمیت کو کم کیے بغیر یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک کسی ملکی بقاء وارتقاء اور اس کی سالمیت اور اس کی عزت واحترام کے جانچنے کا معیار یہ نہیں ہے جو پختہ کار و پختہ سن نسل اس وقت موجود ہے، یا جس نے بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھا ہے، وہ بہتر سے بہتر ہے، اس میں سے ہر شخص ہماری قدیم سوانح کی اصطلاح میں ولی ہے اور علمی اصطلاح میں فاضل اجل علامہ ہے اور دوسری اصطلاحوں میں ان کی جو تعریف کیجیے، یہ بالکل کافی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ نسل جلد ختم ہوجائے گی، اللہ اس کی عمر میں برکت دے، لیکن الٰہی قانون اپنا کام کررہا ہے، اس میں نہ پیغمبروں کا استثناء اور نہ ولیوں کا استثناء ہے اور نہ عالموں کا استثناء ہے، یہ موت و حیات کا قانون سب پر حاوی ہے، یہ بات اطمینان کے لیے کافی نہیں ہے کہ کسی ملک کی ادھیڑ یا بوڑھی نسل بڑی پاکباز ہے، بڑی زندہ دل ہے، بڑی صلاحیتوں کی مالک ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس نسل کو اس نسل کی جگہ لینی ہے، ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے اور جس سے اس ملک کی قسمت وابستہ ہے، جس سے اس ملک کا تاریخی تسلسل قائم رہے گا، وہ نسل کس درجہ کا اخلاقی معیار رکھتی ہے؟ کس درجہ اس کو اپنی طبیعتوں پر قابو اور کنٹرول ہے؟ کس درجہ اس کے اندر برائیوں سے بچنے کی طاقت ہے اور کس درجہ اس میں مخلصانہ ومردانہ جدو جہد پائی جاتی ہے؟

(خطبات علی میاںؒ: ۶/۸۴-۸۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد:۹ | اگست ۲۰۱۷ء | شمارہ:۸

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

نگراں: مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ (جنرل سکریٹری، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

علم کی اہمیت

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ☆ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ☆ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ☆ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ☆ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾

(پڑھئے اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے بنایا، پڑھتے جایئے اور آپ کا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا) (العلق: ۱-۵)

فی شمارہ: -/Rs.10 | Mail: markazulimam@gmail.com | سالانہ زرتعاون: -/Rs.100

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فہرس

یوم آزادی کا پیغام (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

شرک کی شناعت.....۴

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

دعوت وتبلیغ کے تقاضے اور اس کا مؤثر اسلوب.....۶

.....مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

آدابِ علم.....۸

.....مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

توحید کیا ہے؟.....۱۰

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

سجدہ سہو کے احکام ومسائل.....۱۲

.....مفتی راشد حسین ندوی

فراعنۂ مصر-تاریخ کے آئینہ میں.....۱۴

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

اسلام حقوق نسواں کا علمبردار.....۱۶

.....محمد امین حسنی ندوی

اللہ کی محبت.....۱۸

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

حضرت ابوبصیرؓ کا اسوہ.....۱۹

.....ابوالعباس خاں

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جھلک محمد کے میم کی

نتیجۂ فکر:-اقبال سہیل اعظمیؒ

کتاب فطرت کے سرورق پر جو نام احمد رقم نہ ہوتا
تو نقش ہستی ابھر نہ سکتا وجود لوح وقلم نہ ہوتا

یہ محفل کن فکاں نہ ہوتی جو وہ امام امم نہ ہوتا
زمیں نہ ہوتی، فلک نہ ہوتا، عرب نہ ہوتا، عجم نہ ہوتا

ترے غلاموں میں بھی جو تیرا ہی عکس شانِ کرم نہ ہوتا
تو بارگاہ ازل سے اس کا خطاب خیر الامم نہ ہوتا

ہر اک سویدائے دل سے پیدا جھلک محمد کے میم کی ہو
دل اس کی خلوت سرا نہ بنتا جو نقش یہ مرتسم نہ ہوتا

نہ روئے حق سے نقاب اٹھتا، نہ ظلمتوں کا حجاب اٹھتا
فروغ بخش نگاہ عرفان اگر چراغ حرم نہ ہوتا

نہ کرتی خود شان کبریائی اگر تقاضائے خود نمائی
تو خاک کا ذرۂ کمتر وجود سے متہم نہ ہوتا

سوائے صدیق کون پاتا حضور انور کی جانشینی
کہ وہ نہ ہوتے تو یوں جہاں میں بلند دیں کا علم نہ ہوتا

اریکہ آرائی نبوت کا فخر فاروق ہی کو ملتا
جو سلسلہ وحی آسماں کا حضور پر مختتم نہ ہوتا

خلافت راشدہ کا منصب اگر نہ ہوتا نصیب عثمان
تو دفتر وحی آسمانی مرتب و منتظم نہ ہوتا

زہے علو مقام حیدر خوشی میں کہتے تھے خود پیمبر
کہ فتح ہوتا نہ حصن خیبر جو آج یہ ابن عم نہ ہوتا

مدیر کے قلم سے

یوم آزادی کا پیغام

بلال عبدالحی حسنی ندوی

۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء میں جن طویل قربانیوں کے بعد ملک آزاد ہوا تھا، آج وہ دوبارہ غلامی کے طوق وسلاسل پہننے کے لیے تیار ہے، اور وہ غلامی ضمیر کی غلامی ہے جس سے بدتر کوئی غلامی نہیں ہوسکتی، اور جس کا نتیجہ مکمل غلامی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے کلکتہ میں انگریزوں نے سات سمندر پار سے آکر قدم جمائے تھے، اور اس وقت کے آزاد متحدہ ہندوستان کے حکمرانوں نے ان پر اعتماد کیا تھا، مگر یہی زائد اعتماد ان کو لے ڈوبا، آج وہی صورت حال اختیار کی جارہی ہے، اسرائیل پر حد سے زیادہ اعتماد ایک ایسی قوم پر بھروسہ کرنے کے مترادف ہے جس نے ہمیشہ انسانیت کا خون چوسا ہے، اور بڑی بڑی طاقتوں کو انہوں نے اپنی خفیہ سازشوں سے اپنا غلام بنایا ہے، خوبصورت الفاظ کے پیچھے جو حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں ان کا اندازہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جس نے قوموں کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

پیام عرفات کے صفحات سے ہمیشہ ملک کے قائدین کو آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ظاہر ہے نقار خانہ میں طوطی کی صدا ہی کیا ہے، مگر ایک محب وطن کی ذمہ داری ہے کہ وہ اہل وطن کو ان خطرات سے آگاہ کرے جو ملک کو گھیرتے چلے جارہے ہیں۔ انگریزی سامراج کے بعد ہی ملک کے بہی خواہوں نے آزادی کی صور پھونکی تھی، ۱۸۵۷ء میں ان کو اس کی بڑی قیمت چکانی پڑی تھی، ہزاروں علماء شہید کیے گئے، اور ۱۹۴۷ء تک لاکھوں لوگ آزادی کی بھینٹ چڑھائے گئے، ۲۶/ جنوری کو یوم جمہوریہ اسی لیے منایا جاتا ہے کہ ملک کی بنیاد جمہوریت پر رکھی گئی اور ایسا قانون تیار کیا گیا جس میں سب کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ چند لوگوں نے اپنے مفادات کی خاطر ملک کے مفادات کا سودا شروع کردیا ہے، ملک کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی گئی تھی: ۱- جمہوریت (Democracy) ۲- سیکولرزم (Secularism) ۳- عدم تشدد (Non-Voilence) ان مفاد پرستوں نے ملک کو بانٹنے کا کام شروع کردیا، تشدد کا راستہ اختیار کرلیا، اور ملک کے ان تین بنیادی ستونوں کو کمزور کرنے کا آغاز ہوگیا، جس پر ایک طاقتور اور رہنمائی کرنے والے ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی، اور جس میں قومی وحدت کو بنیادی حیثیت دی گئی تھی۔

پورے ملک کے اس وقت جو حالات ہیں ان سے ملک کا ڈھانچہ آہستہ آہستہ کمزور ہورہا ہے، اور افسوس کی بات ہے کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں بلند آہنگی کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کرنے والے بھی نہیں، اس وقت ساری طاقت پیسہ کی ہے، ہر چیز بیچی جاسکتی ہے، اور ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔

مسئلہ نہ ہندو کا ہے نہ مسلمان کا، نہ کسی اور اقلیت کا، مسئلہ سچی انسانیت کا ہے، ان حقیقت پسندانہ اصولوں کا ہے جن سے انسانیت کا بھرم قائم ہے، جن سے ایک طاقتور سماج وجود میں آتا ہے جن میں انسان کو اپنی انسانیت پر ناز ہوتا ہے، ایک کمزور بھی سر اٹھا کر چلتا ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے پیچھے انسانیت کی طاقت ہے، جس میں نہ امیر وغریب کا فرق ہے، نہ کمزور اور طاقتور کا، اس کی انسانیت اس کے تحفظ کے لیے کافی ہے۔

اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ سچی بات کہنے والے نہ رہے، برائیاں تو ہوتی ہیں، لیکن اگر ان برائیوں کو برا کہنے والے ختم ہوجائیں گے تو سماج کا سب سے بڑا ناسور ہے، اس کی اگر فکر نہ کی گئی تو پورا ملک خطرہ میں ہے، گھر میں اگر ایک فرد بھی بگڑ جائے تو پورے گھر کی نیند حرام ہوجاتی ہے، دن کا سکون چھن جاتا ہے، پھر مثبت سوچ ختم ہونے لگتی ہے۔

اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خطرات کو سامنے لایا جائے، اور ان سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں، برائیوں کو دور کرنے کی کوششیں کی جائیں، اور کم از کم برائیوں کو برا کہا جائے۔

یوم آزادی کا یہ پیغام سارے ملک کے لیے ہے، لوگوں کو حقیقی آزادی حاصل ہو، ان کے ضمیر آزاد ہوں، من کی بات کہنے کا حق سب کو ہو، اور اجلے من کے ساتھ انسانیت کا درد لے کر یہ ملک آگے بڑھے، قدرت نے اس کو طرح طرح کے خزانوں سے مالا مال کیا ہے، اس کی سب سے بڑی دولت محبت ہے، جو اس کے خمیر میں داخل ہے، انسانی ہمدردی ہے، جس کے واقعات ملک کی تاریخ کا سنہرا باب ہیں، اس تسلسل کو ہر قیمت میں باقی رکھنا ہے، تاکہ یہ ملک اس لائن (Line) سے ہٹنے نہ پائے، جس پر اس کو قائدین آزادی نے اور اس کی راہ میں خون کا آخری قطرہ بہانے والوں نے ڈالا تھا۔

شرک کی شناعت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

بت پرستی سے قبل سارے لوگ ایک ہی مذہب پر قائم تھے، حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے جو دین عطا فرمایا تھا، وہی دین سب کا دین تھا، سب اسی کے ماننے والے تھے، لیکن جب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد بڑھتی رہی اور بیٹوں کے بیٹے ہوتے رہے، پوتے پر پوتے ہوتے رہے، اور مختلف حالات بھی پیش آتے رہے تو وہم نے ان کو بتدریج بت پرستی پر لگادیا، وہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کو نبی اور بڑا بزرگ سمجھتے تھے، لہٰذا یہ سوچا کہ ان کو یاد کرلینا اور ان کا نام لینا اس میں ہمارا فائدہ ہی ہوگا، اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا، تو یہاں سے بات شروع کی، اس کے بعد ''اللہ خوش ہوگا'' یہ بات نکل گئی اور اب یہ باقی ہے کہ ہمارا کام چل جائے گا، اور ہمارا فائدہ ہوجائے گا، چنانچہ اس کے بعد جو نیک لوگ گذرے، ان کے ماننے والے بھی اسی طرح ان کو مقدس ماننے لگے، اور مقدس مانتے مانتے ان کی عبادت کرنے لگے، اور اس عبادت کو ضروری سمجھنے لگے، پھر یہ ہوا کہ ان کی عبادت کرنے کے لیے کوئی چیز علامت ہونی چاہیے، خالی ہوا میں کیسے عبادت کریں، تو ایک چیز علامت کے طور پر سامنے رکھ لی گئی، اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سب کچھ اسی علامت کو سمجھنے لگے، اور خدا کو ماننے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھنے لگے کہ خدا تو سب سے بڑا ہے، لیکن اب وہ کہاں یہ تکلیف کرے گا کہ ہماری بات سنے، اور ہماری مدد کرے، ہمیں تو جیسے دنیا میں ہوتا ہے کہ بادشاہ ہے، بادشاہ ہر کام نہیں دیکھتا اور نہیں کرتا، بلکہ جو اس کے ملازمین ہوتے ہیں ان سے کام چلتا ہے، لوگ سوچتے ہیں کہ اصل بادشاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے، وہ کہاں ہمارے چکر میں پڑے گا، اس سے بہتر ہے کہ اس نے جو آدمی مقرر کیے ہیں، انہیں سے ہم اپنا کام چلالیں، چنانچہ جب یہی چیز لوگوں نے دین کے سلسلہ میں تصور کرلی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو یقیناً ہے، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ سے نہیں لینا ہے، بلکہ ہمیں تو انہیں سے ملے گا جو اللہ کے پسندیدہ ہیں، ان کے اسی تخیل کی ترجمانی قرآن مجید ان الفاظ میں کرتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾ (الزمر: ۳) (اور جن لوگوں نے اس کے علاوہ کارساز بنا رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم ان کی بندگی اس لیے کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ سے مرتبہ میں قریب کردیں)

گویا مشرکین ان بتوں کو اصل خدا نہیں مانتے، مگر ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کو اللہ سے قریب کردیں گے، یہ ان کا کام کردیں گے، تو ان کا اکرام وعبادت کرنا اس لیے ہے کہ یہ ان کو اس خدا تک پہنچادیں گے، اور خوش ہوکر اللہ سے ان کی سفارش کردیں گے، براہ راست وہ اس سے نہیں مانگ سکتے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ ہم وسائط نہ اختیار کریں، اسلام میں وسائط نہیں رکھے گئے، براہ راست اللہ سے مانگنے کا حکم ہے، اس سلسلہ میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو منع کیا گیا ہے، بار بار یہ کہا گیا ہے کہ ہر انسان اللہ سے براہ راست مانگے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز دیتا ہے، ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ویسا بادشاہ نہیں سمجھنا چاہیے جس نے ملازم مقرر کردیئے ہیں، اور کام کرنے کے لیے اپنا ایک اسٹاف بنادیا ہے، اور خود تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا ہے، نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر کام کو دیکھ رہا ہے، قرآن مجید میں کئی جگہ یہ بات آئی کہ کوئی چیز بھی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو وہ ہمارے کرنے سے ہوتی ہے، اور ایک ایک حبہ جو ہے اس کو ہم دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں، ہر کام ہماری ہی اجازت سے ہو رہا ہے، کوئی چیز خود سے کچھ نہیں کر رہی ہے، ہمارے کرنے سے سب کچھ ہو رہا ہے، مثلاً: دوائیں جو اثر ڈالتی ہیں، وہ اس لیے نہیں کہ خود دواؤں میں کوئی اثر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو اللہ نے اثر ڈالنے کا ذریعہ بنادیا ہے، دوا اللہ کے کہنے سے اثر کرتی ہے، اس کے اندر خود سے اثر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے توحید اور شرک کا فرق ہوجاتا ہے، آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کیا کرے گا وہ تو بہت بڑا ہے، ہمارا کام تو یہ چیزیں کرتی ہیں، ان چیزوں میں یہ صلاحیت موجود ہے، اللہ فرماتا ہے کہ ان چیزوں میں بذات خود یہ صلاحیت نہیں ہے، بلکہ ان کے اندر یہ صلاحیت ہم نے ڈالی ہے تب یہ کام کرتی ہیں۔

مشرکین کا حال دیکھیں کہ جب ان سے معبود بنانے کا کوئی

اصول پوچھا جائے تو وہ خود نہیں بتا سکیں گے کہ معبود بنانے کا کیا اصول ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی چیز کو معبود بنائے ہوئے ہے، کوئی کسی چیز کو، اور کسی کو معبود بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہم کو وہ چیز دلا سکتے ہیں، یہ ہمارا وہ کام کر سکتے ہیں جو انسان نہیں کر سکتا، حالانکہ پتھر وہ کام کیسے کر سکتا ہے جو انسان نہیں کر سکتا؟ اور اسی طرح لکڑی کیسے کر سکتی ہے، درخت اور جانور کیسے کر سکتا ہے، جن معبودان باطل کو انسانوں نے معبود بنا رکھا ہے، ان کو دیکھیں تو ان کا ذرا بھی عقل سے تعلق معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ چیزیں ایسی ہیں کہ سب دیکھ رہے ہیں کہ وہ خود کچھ نہیں ہیں، بلکہ انسان ان کو جس طرح چاہے استعمال کرے، چاہے تو اٹھا کر پٹخ دے، توڑ دے یا جو چاہے کرے، وہ اس سے انکار بھی نہیں کر سکتیں، تو ایک طرف انسان اس پر پوری طرح حاوی ہے، وہ جو چاہے اس کے ساتھ معاملہ کرے، اور دوسری طرف مشرکین یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ہم پر حاوی ہیں، اور ہمارے سارے کام انجام دینے پر قادر ہیں، یہ ہماری مصیبت کو ٹال سکتے ہیں، پریشانی رفع کر سکتے ہیں، ہمیں کامیاب بنا سکتے ہیں، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں کیسے جوڑ کھا سکتی ہیں، ان باتوں کا عقل سے بالکل تعلق نہیں ہے، مگر افسوس کہ انسانوں نے اس کو نہ سمجھا اور بت پرستی میں ڈوبتے چلے گئے، چنانچہ یہی بت پرستی عربوں میں اندھا دھند قسم کی آئی، بت پرستی ان کے یہاں اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اخیر میں بہت بڑھ گئی تھی، کیونکہ بے عقلی کی کوئی حد نہیں ہوتی، عقل کی تو پھر بھی حد ہوتی ہے، لیکن بے عقلی کے بعد کوئی حد نہیں، انسان جو چاہے کرے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت زیادہ ناپسند ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، کیونکہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے، سارا احسان اسی کا ہے، ذرہ ذرہ اسی کا بنایا ہوا ہے، اور اس نے انسان کے فائدہ کے لیے ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے، زمین میں غلہ اور پھلوں کے پیدا ہونے کی صلاحیت رکھی، جانوروں کو پیدا کیا، چاند و سورج کی گردش بنائی، اور ان سب کا مقصد یہی بتایا کہ یہ سب چیزیں انسانوں کے فائدہ کے لیے ہیں، گویا یہ سب چیزیں انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، ہم انسانوں پر یہ اس کا کرم ہے، لیکن ہم اس کو بھول کر ایسی چیزیں اختیار کر لیتے ہیں جن کے متعلق صاف نظر آتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتیں، لیکن ہم ان کو سمجھتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ انہیں سے مل رہا ہے، ہم کو سارا فائدہ انہیں سے حاصل ہو رہا ہے، لہٰذا انہیں سے مانگنے سے ہم کو حاصل ہوگا، تو اللہ کو ظاہر ہے یہ بات ہرگز پسند نہیں ہو سکتی ہے؟ کیونکہ یہ کھلا ہوا شرک ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ شرک ہی ناپسند ہے، شرک میں مبتلا ہونے کے بعد انسان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے بعد دنیا کی ساری لغویات میں پڑ جاتا ہے، ہر طرح کے گناہ اور برائیاں اختیار کر لیتا ہے، جس کی ایک بڑی وجہ خواہش نفس پر تعمیل ہے جو اس کو ہر برائی کے کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے، اس لیے کہ اس کے سامنے کوئی تعلیم نہیں ہوتی، وہ جس کی عبادت کرتا ہے وہ اس کو نہ کچھ بتا سکتا ہے، نہ سکھا سکتا ہے، نہ توجہ دلا سکتا ہے، اس کے نزدیک بس یہ بات ہے کہ پوجا کر لی جائے اور اس کے بعد جو کیا جائے سب جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر ایک کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہے، ظاہر ہے کہ ہر کوئی اسی کی مخلوق میں سے ہے، ہر ایک کے اندر جو طبیعتیں اور فطرتیں اور جو خصوصیات ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں، جس نے مختلف خصوصیات بنا کر انسانوں میں ڈالی ہیں، اور دوسری مخلوقات پر انسانوں کو اختیار کی صفت سے نوازا ہے، اور بعض ایسی خصوصیات بھی عطا کی ہیں جو دوسری مخلوقات کو ملنے کے علاوہ جنات بھی اس سے محروم ہیں، ان کی خصوصیات سے انسانوں کی خصوصیات کچھ بڑھی ہوئی ہیں، جس کا علم قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے، ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ﴾ (اور یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی)

یعنی انسان کو معزز ترین بنایا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو اپنا خلیفہ و نائب بنایا ہے، تو یقیناً وہ خلیفہ ساری مخلوقات سے بہتر ہوگا، جبھی خلافت کا کام اس کے سپرد کیا جائے گا، اسی لیے دنیا میں جو بھی فائدے اور نعمتیں ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ انسان کے فائدے کے لیے متعین کیا ہے، تاکہ انسان اس دنیا میں اچھی طرح کام کر سکے، اور حسن کارکردگی کی اعلیٰ مثال پیش کر سکے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے سے باز رہیں، ہر لمحہ اپنا جائزہ لیتے رہیں اور ہمیشہ چوکنا رہیں کہ کہیں شیطان اپنے حربے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

دعوت وتبلیغ کے تقاضے اور اس کا مؤثر اسلوب

(مرکز الامام أبی الحسن الندوی دار عرفات کے طلبائے افتاودعوہ سے اہم خطاب)

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

مبارک باد کے مستحق ہیں وہ لوگ جنہوں نے ایک ایسی راہ اختیار کی جو دین کی خدمت کی راہ ہے، دنیا میں بہت سی راہیں ہیں، تعلیم کے بہت سے شعبے ہیں اور عمل کے بہت سے راستے ہیں، دنیا بہت وسیع ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ راستہ اختیار کرنا جو کہ اصلاً قربانی کا راستہ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے قربانی کا فیصلہ کیا ہے، ظاہر ہے اس راستہ میں وہ مادی کشش نہیں ہے جو دوسرے راستوں میں ہیں، ویسے اللہ تبارک وتعالیٰ راستے کھول دیتا ہے، اور اس راستہ سے بہت سے لوگوں کو نوازتا ہے، یہ ایسا راستہ ہے کہ اس راستہ والے کی سب تعظیم کرتے ہیں، تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، کہ اس راستہ پر چلنے والوں کی تعظیم ملوک ورؤساء نے کی اور وہ مرعوب ہوئے، اگر اس راستہ میں اخلاص کے ساتھ رہا جائے اور اس کے جو تقاضے ہیں وہ پورے کیے جائیں تو اللہ اسی راستہ سے عزت وکرامت عطا فرماتا ہے، اس لیے یقیناً وہ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے یہ عظیم فیصلہ کیا، اور اس پر قائم رہے۔

خدمت دین کے دو راستے ہیں، ایک راستہ افتاء کا ہے اور ایک دعوہ کا، ''افتاء'' اس وقت کا ایک وسیع اور اہم موضوع ہے، پہلے اس کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو اب ہے، پہلے دین پر اس طرح ہر طرف سے حملے نہیں ہو رہے تھے جس طرح اب ہو رہے ہیں، اور جو حملے ہو رہے تھے وہ بہت محدود تھے، وہ حملے کتابوں میں تھے، لیکن اب وہ حملے گھر گھر پہنچ رہے ہیں، اور دین کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے جا رہے ہیں، اس وقت جو موضوعات چل رہے ہیں، ان سے بہت سے لوگ واقف ہیں، ہر جاہل آدمی بھی آج دوسرے ذرائع سے ان سے واقف ہے، اسی لیے دین پر جس طرح اس وقت ہر جہت سے حملہ ہو رہا ہے، تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا، یہ حملہ مختلف نوعیت کا ہے، سب سے زیادہ خطرناک یہ ہے کہ یہ حملہ عسکری بھی ہے، فکری بھی ہے، منہجی بھی ہے، سیاسی بھی ہے، ہر جہت سے دین پر حملہ ہو رہا ہے، اور دین پر حملہ ہونے کی وجہ سے، دین کی فکر رکھنے والے اور دین کا کام کرنے والے اس حملہ کا شکار ہو رہے ہیں، یا وہ خطرات سے دوچار ہو رہے ہیں، سخت آزمائشوں سے گذر رہے ہیں، جو عالم غیر اسلام ہے وہاں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن اس وقت عالم اسلام میں جو ہو رہا ہے وہ اس سے زیادہ خطرناک ہے، غرض کہ جن لوگوں نے خدمت دین کا راستہ اختیار کیا، جو کہ بظاہر قربانی کا راستہ ہے، جس پر چلنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ راستہ کھولتا ہے، وہ اس راستہ سے وہ ساری عزت وکرامت بھی عطا فرماتا ہے جو ایک انسان کا مادی تقاضا ہے، اس وقت کا جو مسئلہ ہے وہ یہ کہ ہر طرف سے کتابوں کے ذریعہ بھی اور جو دوسرے وسائل اعلام ہیں ان کے ذریعہ سے بھی اسلام پر حملہ ہو رہا ہے۔

اعلام کی بہت سی قسمیں ہیں، اعلام جس کو میڈیا کہتے ہیں، یہ پہلے کنٹرول میڈیا تھا، اگر اس کی تاریخ پڑھیں تو اصلاً میڈیا اس لیے تھا کہ لوگوں کی جہالت کو دور کیا جائے، ان کو واقف کرایا جائے، اعلام کے معنی ہی واقف کرانے کے ہیں، انگریزی میں اس کو انفارمیشن کہتے ہیں، اس کے معنی اطلاع کے ہیں، اردو میں ابلاغ کہتے ہیں، اس کے معنی ہیں پہنچانا، تو میڈیا کا مطلب یہ ہوا کہ لوگوں تک حقائق کو پہنچایا جائے، اگر اس کی تاریخ پڑھیں تو یہی اس کی ابتداء ہے، اور کہا یہ جاتا ہے کہ ابتداء میں میڈیا حکومت کے کنٹرول میں رہی، لہٰذا جو باتیں پہنچی وہ ذمہ داری کے ساتھ پہنچائی گئیں، گویا یہ اس کی مختصر تاریخ ہے، یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی تک میڈیا کی تاریخ پڑھیں تو میڈیا کنٹرول میڈیا معلوم ہوتا ہے، لیکن اس وقت سب سے زیادہ جو زیادتی ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ میڈیا اس وقت آزاد ہے بلکہ گمراہ ہے، اس پر نہ گورنمنٹ کا کنٹرول ہے، نہ صاحب علم کا، نہ جاہل کا، ہر شخص کے ہاتھ میں میڈیا کے وسائل پہنچ گئے ہیں، اسی لیے متعدد بار ایسا ہوتا رہتا ہے کہ بہت سی چیزوں کی بعد

میں تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں تھی، میڈیا کے غلط اطلاع دینے کی بہت سی مثالیں ہیں۔

اس وقت میڈیا نے نظام اسلام کو نشانہ بنایا ہے، جو اسلام کا نظام عدل ہے اس کو نظام ظلم قرار دے دیا ہے، اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ عدل کو ظلم قرار دے دیا گیا، روشنی کو جہل قرار دے دیا گیا، اور اس کے لیے ایسے لوگوں کو استعمال کیا جارہا ہے جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں اور غلط نمائندگی کر رہے ہیں، اسی لیے افتاء کا مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت اس کو جتنی اہمیت حاصل ہے وہ پہلے حاصل نہیں تھی، پہلے لوگ قاضی ہوتے تھے، حکومت کے نظام کے ماتحت ہوتے تھے، مفتی ہوتے تھے اور سماج محدود تھا، اس کے وسائل بھی محدود تھے، اب یہ بات نہیں رہی، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ ایسے افراد کثرت سے پائے جائیں جو اسلام کی صحیح ترجمانی کرسکیں، افتاء کے معنی ہیں: ترجمانی کرنا، یعنی اسلام کے حکم کی ترجمانی کرنا، اور اس کی وضاحت کرنا کہ وہ نظام عدل ہے، تو اس وقت کے افتاء کے لوگوں کا یہ کام ہے۔

افتاء کے سلسلہ میں ایک بہت بڑا مسئلہ احساس مسئولیت کا ہے، بعض وقت استفتاء ایسا تیار کیا جاتا ہے کہ مفتی اس استفتاء کی روشنی میں ایسا فیصلہ کردیتا ہے جو نقصان دہ ہوتا ہے، بعد میں اس کے برے نتائج سامنے آتے ہیں، گذشتہ عہد میں اس کی آپ کو بہت مثالیں ملیں گی کہ مفتی کو گمراہ قرار دیا گیا ہے، واقعہ کو غلط رخ سے پیش کیا گیا ہے، اس لیے مسئولیت کا احساس ضروری ہے، یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس سے وابستہ افراد بحث وتحقیق کے کام کو جاری رکھیں، اپنے علم کو وسعت دیں، اور جو کچھ بھی اسلام کے نظام فقہ کی کتابیں ہیں، ان کو اور قضایا معاصرہ پر جو کتابیں لکھی جارہی ہیں ان کو پڑھیں، بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسلام میں ان کا کوئی حل نہیں ہے، تو یہ بحوث فقہیہ جو قائم ہیں، کئی ملکوں میں، کویت، سعودی عرب اور ہندوستان میں فقہ اکیڈمی ہے، تو وہاں سے ان موضوعات پر جو رسالے شائع ہوتے ہیں، ان میں موجودہ مسائل پر بحث ہوتی ہے، تو آپ ان سے اور دیگر ذرائع سے اپنے مطالعہ کو وسیع کریں، اور جو مصادر فقہ ہیں ان میں آپ کی گہری نظر ہو، اور جو معاصر قضایا ہیں ان کو سمجھیں، اور فتوی دینے میں احتیاط کریں کہ اس کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔

اسی طرح ''دعوہ'' کا جو موضوع ہے، یہ بھی اس وقت اسی طرح اہم ہے، دعوت کے کام کے لیے بہت وسائل ہیں، جیسے ابلاغ کے وسائل ہیں، دعوہ میں ابلاغ کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں، اور بحث وتحقیق کی کتابوں کے ذریعہ بھی دعوہ کا کام ہوسکتا ہے، لقاءات کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، اور اجتماعات کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، مساجد میں نشستوں کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، اور بہت سے دیگر وسائل دعوت کے آگئے ہیں، جن سے دوسرے تک آپ اپنی بات پہنچا سکتے ہیں، ان کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس وقت اسلام کے خلاف جو تحریک چل رہی ہے، اس کے لیے دعوت کا راستہ بہت اچھا راستہ ہے، اس کے لیے یہی ہے کہ آپ اسلام کی حقانیت لوگوں تک پہنچائیں، اس سلسلہ میں پیام انسانیت کا کام بھی بہت اچھا کام ہے، یہ دعوت ہی کا کام ہے، موجودہ دور میں اسلام سے نفرت اور وحشت پھیلائی جارہی ہے، اور اس کے لیے وجوہ تلاش کیے جارہے ہیں، تو بہت سے لوگ ہیں جن کے دلوں میں نفرت نہیں ہے تو ان کے دلوں میں نفرت پیدا کی جارہی ہے، غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، ان کو دور کرنے کی ضرورت ہے، اس وقت دعوت کا میدان بہت وسیع ہوگیا ہے، لوگوں نے اس کے مختلف مسالک اختیار کیے ہیں، ایسی کتابیں موجود ہیں جن میں داعی کی صفات بیان کی گئی ہیں ان کو پڑھنا چاہیے، خود ہندوستانی علماء کے دعوہ کے تجربات سے واقف ہونا چاہیے، اگر ان سے استفادہ کیا جائے تو یہ کام مؤثر طریقہ سے کیا جاسکتا ہے۔

دعوہ کے لیے بھی افتاء کی طرح علم کی ضرورت ہے، بعض مفکرین نے لکھا ہے کہ دعوت کے لیے کئی شرطیں ہیں، پہلی شرط یہ ہے کہ آپ جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں، آپ خود اس سے پوری طرح واقف ہوں، مخالف اگر کوئی سوال کرے، وہ شبہات پیدا کرے تو آپ جواب دے سکیں، اگر آپ جس کی دعوت دے رہے ہیں، اس سے پوری طرح واقف نہیں ہیں تو آپ کو صدمہ پہنچے گا، وہ کوئی بھی سوال کرسکتا ہے، اصطلاح میں اس کو ''وعی الرسالہ'' کہتے ہیں، یعنی ہم جو پیغام دے رہے ہیں، اس سے ہم خود پوری طرح واقف ہوں..... (باقی صفحہ/۱۷ پر)

آدابِ علم

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

جن لوگوں کا کھیتی باڑی سے تعلق ہے وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ انسان اپنے کھیت میں جس قدر عمدہ اور مناسب زرع کھاد استعمال کرتا ہے، اسی قدر اس کا کھیت برگ و بار لاتا ہے، ٹھیک اسی طرح انسان کا معاملہ بھی ہے، وہ جس قدر اپنی کھیتی کو علم کے پانی سے سیراب کرے گا، اس کے اندر وہ کھاد ڈالے گا جس کا مطالبہ ہے، اسی قدر اس کا دل اچھا ہوتا چلا جائے گا، اور وہ علمی منازل طے کرتا جائے گا، اور پھر اس کی کھیتی خوب برگ و بار لائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ علم کا کام ہی تشنہ لبوں کو سیراب کرنا ہے، اور کج فہمی و کج روی کو دور کرنا ہے، جو شخص علم سے رشتہ جس قدر مضبوط رکھے گا، وہ اسی قدر اپنے اندر ثقل محسوس کرے گا اور اس کو زندگی کے کسی موڑ پر دشواری نہیں ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارا جو نظام بنایا ہے، اگر اس نظام کو ہم سمجھ لیں تو ہم کو کہیں پریشانی ہو ہی نہیں سکتی اور خاص طور سے اشکالات و اعتراضات جو کچے ذہن کی اپج ہیں وہ بھی نہیں پیدا ہو سکتے، موجودہ دور کا ایک المیہ یہ ہے کہ ظاہر میں علم بڑھتا جا رہا ہے، جس کو معلومات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ان کچی معلومات کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اعتراضات و اشکالات کے کانٹے پیدا کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ایک ذہنی انتشار کی فضا عام ہے، جب کہ اگر ان ہی معلومات کو پختہ کر لیا جائے اور علم میں گہرائی ہو اور علم کی جو برکتیں اللہ نے رکھی ہیں، وہ تمام کی تمام چیزیں پائی جاتی ہوں، تو کبھی کسی کو کوئی اشکال پیدا ہو ہی نہیں سکتا، اشکال پیدا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ابھی علم کچا ہے، جو بچے اور بچیاں نیچے کلاس میں پڑھتے ہیں، ان کے دل و دماغ میں بہت سے اشکالات پیدا ہوتے ہیں، لیکن وہ اشکالات آگے کے درجہ میں جا کر ختم ہو جاتے ہیں، اور اس کے بعد اگر بچہ صحیح لائن پر چلتا رہے، مطالعہ کی گہرائی جاری رہے، تو اس کو اشکالات بالکل ناپید ہو جاتے ہیں، کسی بھی قسم کا کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا، درحقیقت انہیں محنتی اور علم دوست لوگوں کو قرآن مجید میں راسخین فی العلم کہا گیا ہے، یعنی ان کے علم کا کھونٹا اتنا مضبوط ہے کہ آندھیاں چلیں یا طوفان اور کیسی ہی موجیں اس کو نگلنے اور اس کو ہلانے کی کوشش کریں، لیکن وہ اپنی جگہ پر مضبوط قائم رہتا ہے، کوئی اس کو ہلا نہیں سکتا۔

آج اس دور کا جو مسئلہ ہے وہ یہی ہے کہ علم کی وسعت بڑھتی جا رہی ہے اور گہراؤ کم ہوتا جا رہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ گہرائی بڑھے، اس کی بہت شدید ضرورت ہے، کیونکہ جب گہرائی ہوگی تو اس کے اندر ثقل بھی ہوگا، بھاری بھرکم وہی شخص ہوتا ہے جس کے اندر گہرائی ہوتی ہے، اسی کو اردو میں بولتے ہیں کہ فلاں کا ٹھوس علم ہے، البتہ جس کے اندر گہرائی نہیں ہوتی تو وہ ایک غبارہ کی طرح ہوتا ہے، آج کل کا علم ایسا ہی ہے، اسی لیے کسی نے ذرا سا کچھ کہہ دیا تو فوراً لڑھکتے نظر آتے ہیں، کسی نے کچھ اشکال کر دیا تو تڑپتے ہیں، یہ سب کم علمی اور سطحی علم کا نتیجہ ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ جلدی کسی کے کہنے اور سننے میں نہ آئیں، اور آج کل جو اعتراضات کی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں ان کو دیکھنے سے پریشان نہ ہوں، آگے بڑھیں تو آپ کو بہت سی باتیں معلوم ہوتی چلی جائیں گی، مگر اس کے لیے مطالعہ ضروری ہے، ظاہر ہے کہ ہر چھوٹا بڑی چیز نہیں سمجھ سکتا، لیکن ہر بڑا ہر چھوٹی چیز سمجھ سکتا ہے، پہلے آپ بڑے بنیں تو خود چھوٹی چیز نظر آ جائیں گی، کیونکہ آدمی جب بڑا بنتا ہے تو اس کی روشنی تیز ہوتی ہے، اور علم ایک روشنی ہے، جب آدمی بڑا ہوگا تو روشنی اس کی تیز ہوگی، جب روشنی تیز ہوگی، تو چھوٹی چیزیں بھی نظر آئیں گی، اور علم میں چھوٹا ہوگا تو پھر ظاہر ہے بڑی چیزیں بھی نظر نہیں آئیں گی، چھوٹی تو بہت دور کی بات۔

آج کل کم علمی ہی کا نتیجہ ہے کہ عقائد تک داؤ پر لگ گئے ہیں، اس لیے عقائد میں جو بڑی بڑی چیزیں ہیں ان کو ہر آدمی کو سمجھنا چاہیے، بچہ ہو یا بڑا ہو، اور یہاں تک کہ جاہل ہو یا پڑھا لکھا ہو، جاہل کے اندر بھی عقل عام ہے، ان کے اندر اللہ نے جو چیزیں رکھی ہیں، وہ ان کو استعمال کریں تو عقیدہ درست ہو سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عقیدہ کی درستگی کے لیے سارے عالم میں ایسی نشانیاں بکھیر رکھی ہیں کہ آخرت میں جانے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم کیا کرتے ہم کو معلوم نہیں تھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے کیوں

اپنی عقل کا استعمال نہیں کیا، اور جو عقل والے عقل والی باتیں کرتے تھے تم ان کی خدمت میں کیوں نہیں گئے، اسی لیے اہل جہنم کا قول قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے: ﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ أَصْحَابِ السَّعِيْرِ﴾ (الملك: ۱۰) یعنی اگر ہم عقل کا صحیح استعمال کرتے یا سنتے تو ہم جہنم والوں میں سے نہ ہوتے، معلوم ہوا عقل عام بھی اللہ نے اسی لیے دی ہے، تاکہ آدمی صحیح راستے کو پہچانے، اپنے رب کو پہچانے، معرفت عامہ اس کو حاصل ہو۔

البتہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علم سے وابستہ کیا ہے، ان کو اس علم سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اور اس کے لیے خوب محنت کرنی چاہیے، علم برگ وبار اسی وقت لائے گا جب علم سے وابستگی صحیح ہوجائے گی، اور اس کے اندر گہرائی پیدا ہوجائے گی، اور اس کے اندر وزن پیدا ہوجائے گا، جب وزن پیدا ہوجائے گا تو آپ باوزن ہوجائیں گے اور اگر اس کے اندر وزن نہیں ہوگا تو بے وزن ہوں گے، اور آپ کی حیثیت سطحی ہوگی، آپ کو جو چاہے گا جہاں چاہے گا جیسا چاہے گا استعمال کرلے گا، اور اگر آپ کے اندر وزن ہوگا تو ہر آدمی نہ آپ کو ہلا سکے گا، اور نہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو فکر دی ہے قرآن وحدیث کے مطالعہ سے اس سے آپ کو کوئی بہکا سکے گا، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مطالعہ ہو، اور پھر صحیح مطالعہ ہو، اور یہ اسی وقت ہوگا جب ہر چیز ترتیب سے ہو، اگر مطالعہ میں ترتیب کا خیال نہ رکھا گیا تو بسا اوقات انسان بہکی ہوئی باتیں کرنے لگے گا، اسی لیے ہمارے بہت سے وہ لوگ جو آج کل علم حاصل کررہے ہیں، وہ علم میں بچے ہوتے ہیں، اور اپنے کو سمجھ لیتے ہیں کہ ہم بہت طاقتور ہیں، توانا ہیں، نتیجۃً وہ ایسی کتابیں مطالعہ میں لے آتے ہیں، یا ایسی چیزیں پڑھنے لگتے ہیں جن سے وہ فکری بے راہ روی کا شکار ہوجاتے ہیں، اور پھر شکار خود ہی نہیں ہوتے بلکہ کتنوں کو اس کا شکار کردیتے ہیں، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مطالعہ ہو، علم ہو، اور اس کی گہرائی ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے ہر انسان کو جو صفات دی ہیں، ان صفات کی معرفت بھی ضروری ہے، کیونکہ اللہ کو بھی جاننا ضروری ہے اور اپنے کو بھی پہچاننا ضروری ہے، اگر آپ نے برتن نہیں جانا کہ اس برتن میں کیا رکھا جائے گا، اور چیز آپ نے لے لی تو معاملہ بگڑ جائے گا، اس لیے دونوں کو جاننا ضروری ہے کہ فلاں چیز فلاں برتن میں رکھی جائے گی، مثلاً علم ہی ہے، علم جو ہے اس کی مثال دودھ سے دی گئی ہے، تو دودھ ہر برتن قبول نہیں کرتا، اگر آپ نے دال والے برتن میں دودھ لے لیا تو دودھ پھٹ جائے گا، دودھ کے لیے بہت اچھا برتن ہونا چاہیے، بالکل صاف ستھرا، اس کے بعد پھر یہ ہے کہ اس دودھ کو پکایا جائے، اگر وہ نہ پکایا گیا تو بھی پھٹ جاتا ہے، اور ہر ایک کو ہضم نہیں ہوتا، لہٰذا ٹھیک اسی طرح علم کا حال بھی ہے، اگر طالب علم نے اپنے ظرف کو مانجھا نہیں اور علم کا دودھ لے لیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا علم پھٹ جائے گا، اور کسی کام کا نہیں رہے گا، اسی لیے قرآن کی آیات میں تزکیہ پہلے لایا گیا ہے، تزکیہ کے معنی یہی ہیں کہ آپ اپنے ظرف کو صاف کرلیں، جس کے بغیر کچھ نہ ہوگا۔

غرض کہ تحصیل علم کی راہ میں چند اصولی باتوں کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو وہ علم نہایت قابل قدر اور برگ وبار والا ہوگا، ورنہ اس علم کی حیثیت سے معلومات سے بڑھ کر کچھ نہ ہوگی، اس سلسلہ میں پہلی بات یہی ہے کہ انسان اپنی نیت کو خالص کرے، اور اپنے ظرف کو علم کے لیے بالکل صاف ستھرا کرے، اس علم کی اہمیت کو سمجھے، اس کے ثقل سے باخبر ہو، اور اس کے نتائج پر نگاہ رکھے، اس کو معرفت الٰہی کے حصول کا ایک زینہ سمجھے، بلکہ زندگی گذارنے کے لیے جس طرح سانس کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح اس کا ہونا بھی ضروری سمجھے، کیونکہ علم ہی وہ زیور ہے جس کے متعلق مستقل اضافہ کی حدیث پاک میں دعا کی گئی ہے، بقیہ مستقل اضافہ کی سوائے علم کے کسی اور چیز کے لیے حتی کہ بڑی سے بڑی عبادات کے لیے بھی دعا وارد نہیں ہوئی ہے، علم کے متعلق آتا ہے: "رب زدنی علما" (اے میرے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما) اس سے معلوم ہوا کہ علم انسانی زندگی میں پرواز کی روح ہے، جس کے بغیر ترقی ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں تحصیل علم کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا گیا ہے، کیونکہ علم وہ زیور ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے وابستگی حاصل کرلے تو ہر مشکل اس کے لیے حل ہوجائے گی، موجودہ دور میں مدارس اسلامیہ کا قیام بھی انہیں مقاصد کے تحت ہے، جہاں ان چیزوں کی وقتاً فوقتاً تجدید کرائی جاتی رہتی ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ

توحید کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

نبی ﷺ کا علم:

اللہ کے رسول ﷺ جو آخری نبی اور سب سے برگزیدہ، سب سے بڑے نبی ہیں، سب سے محبوب نبی ہیں، آپ ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے علم کا ایک حصہ عطا فرمایا، لیکن یہ سمجھنا کہ سب کچھ عطا فرمادیا، آپ ﷺ ہر چیز کے جاننے والے ہیں، یہ کلمہ شرک ہے، اس لیے کہ اس میں کیا ہوا؟ اس میں یہ ہوا کہ اللہ کی ''عالم الغیب'' اور ''علام الغیوب'' جو صفت ہے، یعنی تمام چیزوں کے جاننے والے کی صفت، ہم نے اس صفت میں دوسرے کو شریک کردیا، ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے، آپ ﷺ مطلقاً عالم الغیب نہیں ہیں، آپ ﷺ اس غیب کو جاننے والے ہیں جو غیب اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بتایا، ایسی بہت ساری چیزیں ہیں، آپ نے پیشین گوئیاں فرمائیں، بہت سارے واقعات آپ نے بیان کئے، اللہ نے آپ کو بتائے، لیکن کتنے واقعات ہیں کہ آپ ﷺ وہ چیز نہیں جانتے جو آپ کے پیچھے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، حجرہ شریفہ کے دروازہ پر کھڑے ہوئے، آپ نے فرمایا: اندر تشریف لے آیئے، وہ کہنے لگے میں نہیں آسکتا، آپ نے کہا: کیا بات ہے؟ تو کہنے لگے کہ آپ کی چارپائی کے نیچے کتے کا بچہ ہے، اور جہاں کتا یا کتے کا بچہ ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں، پھر آپ نے کتے کا وہ بچہ نکلوایا۔ (سنن أبی داؤد)

اس سے پتہ چلا کہ آپ ﷺ کو معلوم نہیں تھا کہ کتے کا بچہ یا جو جانور ہے وہ آپ کے پلنگ کے نیچے ہے، معلوم ہوا کہ آپ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے، ہر چیز آپ جانیں ایسا نہیں ہے، کتنی چیزیں آپ نے بتادیں، اور کتنی چیزیں نہیں بتائیں، جتنا اللہ نے آپ کو بتادیا وہ آپ نے بتادیا، جو غیب کی خبریں اللہ نے آپ کو دیں وہ آپ نے امت کو بتائیں، لیکن یہ کہ آپ تمام چیزوں کے جاننے والے ہیں، ایسا نہیں ہے، کتے والی یہ ایک مثال عرض کی گئی، اگر حدیث کا مطالعہ کریں تو ایسی دسیوں مثالیں، دسیوں واقعات ہیں جن میں یہ حقائق سامنے آجائیں گے، بعض بعض عجیب وغریب واقعات ہیں، قرآن مجید میں اس کے اشارے بھی ہیں، ایک مرتبہ ایک صاحب آئے اور انہوں نے شکایت کی کہ فلاں صاحب نے ہمارے یہاں چوری کی ہے، آپ ﷺ نے معاملہ طلب کیا، تمام لوگ آئے اور لوگوں نے اپنے اپنے دلائل دیئے، تو جن کو چور سمجھا جارہا تھا، چونکہ ان کو زباں دانی حاصل تھی، وہ چرب زبان تھے، اس لیے انہوں نے اپنی بات بڑی طاقت سے کہی، اتنی طاقت سے کہی کہ آپ ﷺ نے سوچا کہ یہ حق پر ہے، اور آپ ان کے لیے فیصلہ کرنے والے تھے، بعد میں پتہ چلا کہ وہ حق پر نہیں ہے، اس سلسلہ میں باقاعدہ قرآن مجید کی آیت اتری اور یہ کہا گیا کہ آپ اس کے طرفدار نہ بن جائیں جو کہ گویا چرب زبانی سے اپنی بات ثابت کررہا ہے، حالانکہ وہ حق پر نہیں ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا﴾ (النساء: ۱۰۵)

(یقیناً ہم نے آپ پر ٹھیک ٹھیک کتاب اتاردی تاکہ جیسا اللہ نے آپ کو راستہ دکھایا اس کے مطابق آپ لوگوں میں فیصلے کرتے رہیں اور خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ ہوجائیں)

اس سے یہ بات صاف طور پر واضح کردی گئی کہ اصل مسئلہ آپ ﷺ کے سامنے نہ آسکا، جب اللہ نے بتایا تب آپ کو معلوم ہوا، تو ان واقعات سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے، بلکہ آپ ﷺ غیب کی وہ باتیں جانتے تھے، جو اللہ نے آپ کو بتائیں، اس لیے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ آپ مطلقاً عالم الغیب ہیں تو یہ مشرکانہ عقیدہ ہے، ہم اگر یہ نہ کہیں کہ وہ کافر ہوگیا، مشرک ہوگیا تو اتنا تو ضرور کہیں گے کہ یہ عقیدہ مشرکانہ ہے، البتہ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ درحقیقت کافر یا مشرک ہوا کہ نہیں، چونکہ حضور ﷺ نے ہمیں منع کیا کہ جب تک کسی کے اندر ایمان کی ایک علامت بھی ہے تو کافر مشرک نہ کہو، اس لیے ہم لوگ آسانی سے نہ کسی کو کافر کہتے

ہیں نہ مشرک، لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ اس کا یہ عمل مشرکانہ ہے، اس کا یہ عقیدہ مشرکانہ ہے، تو اگر کوئی اللہ کے رسول ﷺ کو عالم الغیب سمجھتا ہے، تو یہ عقیدہ مشرکانہ کہلائے گا، اور ڈر ہے کہ خدانخواستہ اس کا ایمان باقی نہ رہے۔

دعوت فکر و عمل:

غرض کہ اپنے عقیدہ کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، اور جو بھی ہمارے اندر ایسی باتیں داخل ہوگئیں ہیں، ہوسکتا ہے کہ لاشعور میں داخل ہوئی ہوں، ان کو ٹٹولنے اور جائزہ لینے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم خالص عقیدۂ توحید کو مضبوط کریں، یہ سمجھیں کہ اللہ اپنی ذات میں بھی تنہا ہے اور اپنی صفات میں بھی تنہا ہے، اور عبادت کے لیے اس کی ذات تنہا ہے، نہ کسی کی بندگی کی جائے گی، نہ کسی کی وہ عبادت کی جائے گی، جس کو انتہائی تعظیم کہتے ہیں، یا آخری درجہ کی محبت جس کے نتیجہ میں آدمی پھر عبادت کرتا ہے، یہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے لیے ہے، اللہ کے علاوہ کسی کے لیے بھی یہ عمل جائز نہیں۔

توحید کا عقیدہ:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ☆اللّٰهُ الصَّمَدُ☆لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ☆وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾(الاخلاص: ۱-۴)

(بتادیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے، وہ اللہ جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں،، نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا اور کوئی بھی اس کے جوڑ کا نہیں)

سورۂ اخلاص قرآن مجید کی ایک چھوٹی سی سورت ہے، جس میں توحید کے عقیدہ کو بہت طاقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو سورۂ اخلاص کہتے ہیں، یعنی آدمی ہر طرف سے کٹ کر ایک اللہ کا ہوجائے اور تنہا اسی کو سب کچھ سمجھے، وہی ضرورت کا پورا کرنے والا اور تمام مسائل کا حل کرنے والا ہے، اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ آنحضرت ﷺ کو خطاب کرکے فرماتا ہے کہ آپ فرمادیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے، اور پھر اس کے بعد فرمایا کہ "اللہ الصمد" وہ اللہ "صمد" ہے، صمد کا جو لفظ ہے، اس کے ترجمے میں بہت سارے لوگ "بے نیاز" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن جو صحیح مفہوم ہے وہ ادا نہیں ہوتا، حقیقت میں "صمد" اس کو کہتے ہیں جو سب سے بے نیاز ہو، لیکن سب اس کے نیاز مند ہوں، صرف بے نیاز کا جو لفظ ہے اس میں یہ مفہوم آجاتا ہے کہ نہ اس کو کسی کی ضرورت ہے اور نہ کسی کو اس کی ضرورت ہے، حالانکہ "صمد" کا جو لفظ ہے اس میں یہ مفہوم شامل ہے کہ وہ کسی کا ضرورت مند نہیں ہے لیکن سب اس کے ضرورت مند ہیں، سب اس کے سامنے اپنی حاجتیں رکھتے ہیں، اور اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ؛ اس میں وہ عقیدہ جو عیسائیوں کا ہے اس کی بھی نفی کی گئی ہے، اور مطلقاً یہ بات کہی گئی ہے کہ انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرے، توالد وتناسل کا جو سلسلہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے بے نیاز ہے، اور یہ چیز اس کے لیے عیب ہے، اور وہ ہر عیب سے دور ہے اور پاک ہے، اسی لیے نہ اس کا کوئی باپ ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور پھر سورت کے اخیر میں جو بات فرمائی گئی وہ یہ کہ اس کے برابر کا کوئی نہیں ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ یعنی اس کے جیسا کوئی نہیں، اس کے برابر کا کوئی نہیں، سب اس کی مخلوق ہیں، وہ تنہا خالق ہے، ظاہر ہے کہ جو پیدا کرنے والا ہے تو اس کے سامنے مخلوقات میں سے کوئی بھی ہو اور کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن کوئی مخلوق میں خالق کے برابر نہیں ہوسکتا، جو خالق کا مخلوق کا فرق ہے وہ بہرحال قائم رہے گا، اللہ اور اس کی صفات کے سوا دنیا میں جو کچھ موجودات ہیں وہ سب کے سب حادث ہیں، اور سب اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اور اللہ کی ذات قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، وہ ازلی ہے، ابدی ہے، تو وہ مخلوق جو کہ حادث ہو، جس کو اللہ ہی نے پیدا کیا، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ یعنی اپنے خالق کی ہمسری نہیں کرسکتا۔

حدیث کی عظمت

"ایک شخص حضرت سعید بن المسیبؒ کے پاس ان کی بیماری میں عیادت کرنے آیا، اور ایک حدیث پوچھی۔ حضرت سعید لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے اور حدیث بیان کی، اس شخص نے کہا آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ حضرت سعیدؒ نے جواب دیا: یہ مجھ کو برا معلوم ہوا کہ میں لیٹے لیٹے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کروں۔"

سجدہ سہو کے احکام ومسائل

مفتی راشد حسین ندوی

نماز میں اگر کوئی بھول چوک ہوجائے تو بعض صورتوں میں سجدہ سہو کرنے سے تلافی ہوجاتی ہے، چنانچہ بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے پاس شیطان آجاتا ہے، اور اس کو شبہ میں مبتلا کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کو پتہ نہیں رہتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے لہٰذا اگر تم میں سے کسی کو اس طرح کی بات پیش آجائے تو اسے چاہیے کہ بیٹھے بیٹھے دو سجدے کرلے“۔

سجدہ سہو کس طرح کی غلطی پر کیا جائے گا: سجدہ سہو کے ذریعہ سے ہر بھول چوک کی تصحیح نہیں ہوسکتی، اگر بھولے سے کوئی واجب چھوڑ دیتا ہے تو صرف اس کی تلافی سجدہ سہو سے ہوسکتی ہے، لیکن اگر جان بوجھ کر کوئی واجب چھوڑ دیا یا نماز کے کسی فرض کو چھوڑ دیا اور اس کی قضاء بھی نماز کے اندر نہیں کی تو سجدہ سہو سے تلافی نہیں ہوسکتی، بلکہ نماز دہرانی ہوگی، اور اگر کوئی سنت یا مستحب چھوٹ گیا ہے تو سجدہ سہو کے بغیر ہی نماز ہوجائے گی، اور سنت چھوڑنے کی وجہ سے نماز میں جو کمی ہوئی ہے اس کی تلافی سجدہ سہو سے ممکن نہیں۔ (ہندیہ: ۱/۲۶۱)

سجدہ سہو کا طریقہ: جب نماز میں کوئی ایسا سہو ہوجائے جس سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے تو قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھنے کے بعد داہنی طرف صرف ایک سلام پھیریں پھر دو سجدے کریں پھر بیٹھ کر دوبارہ تشہد پڑھیں اور اس کے ساتھ درود ودعا پڑھ کر سلام پھیریں۔ (شامی: ۱/۵۴۶، ہندیہ: ۱/۱۲۵) اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت میں صراحت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کیا، ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہوجائے تو اسے چاہیے کہ تحری کرے کہ صحیح کیا ہے پھر اتمام کرلے، پھر سلام پھیرے پھر دو سجدے کرے“۔ (بخاری ومسلم)

بعض روایات میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ سہو کا ذکر آیا ہے اسی لیے بعض ائمہ کا مسلک یہی ہے۔ اور احناف کے یہاں بھی اگر کوئی سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ سہو کرلے تو معتبر ہوگا لیکن ایسا کرنا مکروہ تنزیہی ہوگا۔ (شامی: ۱/۵۴۶)

جیسا کہ عرض کیا گیا سجدہ سہو بنیادی طور پر کسی واجب کے سہواً چھوٹ جانے سے واجب ہوتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان واجبات کی کچھ تفصیلات درج کردی جائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ سجدہ سہو کن صورتوں میں واجب ہوگا:

۱- کسی فرض یا واجب کو جب اس کی اصل جگہ سے مقدم کردیا جائے تو سجدہ سہو واجب ہوجائے گا، جیسے قراءت سے پہلے رکوع کرلیا یا سورہ فاتحہ سے پہلے ہی دوسری سورت پڑھ لی۔

۲- نماز کے کسی فرض یا واجب کو اس کی اصل جگہ سے مؤخر کردیا تب بھی سجدہ سہو واجب ہوجائے گا، مثلاً پہلی رکعت میں صرف ایک سجدہ کیا اور دوسری رکعت میں اس کی قضاء کرتے ہوئے تین سجدے کیے اس صورت میں بھی سجدہ سہو واجب ہوجائے گا۔

۳- کسی فرض یا واجب کی تکرار کرنا مثلاً ایک رکعت میں دو رکوع یا تین سجدے کرلیے جائیں۔

۴- کسی واجب کو چھوڑ دینا مثلاً تشہد یا سورہ فاتحہ چھوڑ دی یا سری نماز میں جہری یا جہری نماز میں سر کرلیا تو ان تمام صورتوں میں سجدہ سہو واجب ہوجائے گا، اور سجدہ سہو کرلینے سے نماز میں آئے ہوئے نقص کی تلافی ہوجائے گی۔ (شامی: ۱/۵۴۷-۵۴۸، ہندیہ: ۱/۱۲۶، کتاب المسائل: ۱/۳۰۲)

مکمل سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے: فرض کی ابتداء کی دو رکعات اور نفل وسنن کی تمام رکعات میں مکمل سورت فاتحہ پڑھنا واجب ہے، لہٰذا اگر بھولے سے سورہ فاتحہ بالکل ہی نہیں پڑھی یا اس کی ایک آیت بلکہ آیت کے کسی جزء کو بھولے سے چھوڑ دیا تو سجدہ سہو واجب ہوجائے گا، پھر سورہ فاتحہ کا ابتداء میں پڑھنا واجب ہے، لہٰذا اگر کوئی بھولے سے پہلے سورہ فاتحہ نہ پڑھے کوئی دوسری سورت شروع کردے پھر یاد آجائے تو اسے چاہیے کہ سورہ فاتحہ پڑھ کر پھر سے اس کے ساتھ سورت ملائے اور اخیر میں سجدہ سہو کرلے۔

اگر کوئی بھولے سے سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد پھر سے مکمل سورت فاتحہ یا اس کا کچھ حصہ پڑھ لے تو اگر فرض کی ابتداء کی دو

رکعات یا سنن ونوافل کی کسی بھی رکعت میں ایسا ہوا ہے تو اس کی تلافی کے لیے سجدہ سہو واجب ہے، لیکن اگر فرض کی آخری رکعتوں میں ایسا ہوجائے یا سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد سورہ ملالی اس کے بعد پھر سے سورہ فاتحہ پڑھ لی تو سجدہ سہو کی ضرورت نہیں، اس کے بغیر ہی نماز صحیح ہوگئی ہے۔(ہندیہ:۱/۱۲۶)

سورہ فاتحہ یا سورہ پڑھے بغیر رکوع میں چلا گیا تو کیا کرے: اگر کسی شخص نے بھولے سے سورت فاتحہ ترک کردی یا سورہ فاتحہ تو پڑھ لی لیکن اس کے ساتھ سورہ نہیں ملائی اور جب رکوع میں چلا گیا یا رکوع کرنے کے بعد قومہ میں پہنچ گیا تو اس کو یاد آگیا تو اس پر لازم ہے کہ جو کچھ بھولے سے چھوٹ گیا تھا اس کو پڑھے پھر دوبارہ رکوع کرکے اخیر میں سجدہ سہو کرے۔(شامی:۱/۵۴۸، ہندیہ:۱/۱۲۶)

فرض کی آخری رکعات میں سورہ فاتحہ پڑھنا بھول جائے یا سورہ فاتحہ کے ساتھ بھولے سے سورہ ملالے تو سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا۔(ہندیہ:۱/۱۲۶)

قومہ اور جلسہ میں جلد بازی: نماز میں اعتدال اور اطمینان بھی واجبات میں سے ہے، لہٰذا اگر قومہ اور جلسہ میں رکے بغیر ہی نماز پڑھ لی تو اگر ایسا جان بوجھ کر کیا تو سجدہ سہو سے بھی تلافی نہیں ہوگی، بلکہ واجب چھوڑنے سے جو کمی آگئی ہے وہ نماز دہرانے سے ہی دور ہوسکتی ہے، لیکن اگر بھولے سے ایسا ہوگیا تو سجدہ سہو کرلینے سے تلافی ہوجائے گی۔(ہندیہ:۱/۱۲۷ شامی:۳۴۲)

تشہد چھوڑ دینا: اگر قعدہ اولی یا قعدہ اخیرہ میں پورا تشہد بھولے سے چھوڑ دیا یا اس کا کچھ حصہ بھولے سے چھوٹ گیا تو سجدہ سہو واجب ہوجائے گا، اسی طرح قعدہ میں بیٹھتے ہی تشہد پڑھنا واجب ہے، لہٰذا اگر قعدہ میں بیٹھ کر بجائے تشہد کے کوئی اور چیز پڑھنے لگا تب بھی سجدہ سہو واجب ہوجائے گا، اسی طرح فرض کے قعدۂ اولی میں تشہد کے بعد تیسری رکعت کے لیے فوراً اٹھ جانا واجب ہے، لہٰذا اگر کوئی تشہد کے بعد درود شریف پڑھنے لگا تو اگر "اللھم صل علی محمد" تک پڑھ لیا یا اس سے زیادہ پڑھ لیا تو سجدہ واجب ہوجائے گا، اس سے کم پڑھا تو واجب نہیں ہوگا، اسی طرح اگر قعدۂ اولی میں تشہد کو مکرر پڑھ لیا تب بھی سجدۂ سہو واجب ہوجائے گا، لیکن اگر قعدۂ اخیرہ میں تشہد کی تکرار کی، یا نوافل میں قعدۂ اولی کے بعد درود شریف پڑھ لیا تو سجدہ سہو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔(شامی: ۱/۵۴۸-۵۴۹، ہندیہ:۱/۱۲۷)

جہر واخفاء ترک کردینا: سری نمازوں میں آہستہ پڑھنا اور جہری نمازوں میں امام کے لیے جہر کرنا واجبات میں سے ہے، لہٰذا اگر سری نمازوں میں جہر کردیا، یا جہری نمازوں میں امام نے سراً پڑھا تو سجدہ سہو لازم ہوجائے گا، اور اگر پوری قراءت اس طرح نہیں کی کچھ کی تو اگر تین چھوٹی آیتوں یا ایک بڑی آیت کے بقدر خلافِ واجب قراءت کردی تو سجدہ سہو لازم ہوجائے گا، مولانا رشید احمد لدھیانوی فرماتے ہیں: "بشمول حروف محذوفہ تیس حروف یا زیادہ پڑھ لینے سے سجدہ سہو لازم ہوجاتا ہے، "الرحمٰن" تک انتیس حروف ہیں لہٰذا آگے ایک حرف بھی پڑھا گیا تو سجدہ سہو واجب ہوجائے گا"۔(احسن الفتاوی:۴/۳۱، شامی:۱/۵۴۸)

یہ خیال رہے کہ یہ حکم قراءت کا ہے، بقیہ اگر کوئی شخص بھولے سے تشہد، ثنا، درود شریف یا تسبیحات جہراً پڑھ لے تو اس کی وجہ سے نا تو نماز میں کوئی خرابی آئے گی نہ سجدہ سہو لازم ہوگا لیکن قصداً ایسا نہیں کرنا چاہیے۔(شامی:۱/۵۴۹)

فرض کی آخری رکعت کے بعد قیام: اگر کوئی شخص فرض نماز میں آخری رکعت کے بعد بجائے قعدہ کرنے کے کھڑا ہوگیا، تو اگر اس زائد رکعت کا سجدہ کرنے سے پہلے پہلے یاد آجائے تو حکم یہ ہے کہ وہ قعدہ کی طرف لوٹ آئے اور سجدہ سہو کرلے، نماز ہوجائے گی، لیکن اگر زائد رکعت کا سجدہ کرلیا اس کے بعد یاد آیا تو سجدہ سے جیسے ہی سر اٹھائے گا اس کی فرض نماز نفل بن جائے گی، اب بہتر یہ ہے کہ ایک رکعت مزید ملالے، اگر یہ مسئلہ ظہر، عصر یا عشاء میں پیش آیا تھا تو یہ چھٹی رکعت ہوگی، فجر میں پیش آیا تو یہ چوتھی رکعت ہوگی، مغرب میں پیش آیا ہو تو مزید رکعت نہیں ملائے گا، اس لیے کہ چار رکعت نماز ملائے بغیر ہی ہورہی ہے۔(شامی:۱/۵۵۲)

اگر فرض کی آخری رکعت کے بعد قعدہ کرلیا تھا، اس کے بعد زائد رکعت کے لیے کھڑا ہوگیا تو جب تک اس زائد رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو حکم یہ ہے کہ لوٹ آئے اور سجدہ سہو کرلے نماز ہوجائے گی، لیکن اگر زائد رکعت کا سجدہ کرلیا تو ایک رکعت مزید ملالے یعنی فجر میں چوتھی، مغرب میں پانچویں..... (باقی صفحہ ۱۵ پر)

گذشتہ سے پیوستہ

فراعنۂ مصر-تاریخ کے آئینہ میں

عبدالسبحان ناخدا ندوی

رمسیس ثانی کو فرعون موسی قرار دینے پر قرآن کریم اور تاریخ کے طالب علم کے ذہن میں فطری طور پر ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے، یعنی تاریخ کا طالب علم یہ سوال کرسکتا ہے کہ جس فرعون کو مصری تاریخ کا سب سے عظیم فرعون قرار دیا گیا، وہ آخر ظالم، مفسد، مسرف اور بدترین قسم کا قاتل کیسے ہوسکتا ہے، جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے، اسی طرح قرآن کا طالب علم یہ سوال کرسکتا ہے کہ جو فرعون ایسا ظالم، مفسد، قاتل اور شر پسند تھا وہ آخر تاریخ میں اتنا بڑا مقام کیسے پا گیا؟ اس تضاد سے بچنے کے لیے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ فرعون موسی رمسیس ثانی نہیں تھا، لیکن غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب ممکن ہے، فراعنہ مصر کی تاریخ غیر جانب دار، جرأت مندانہ مصنفین کی ترتیب دی ہوئی نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو تاریخ سچائی کا مظہر اور سچے واقعات کا تسلسل ہوتی، مصر کے شاہی فرعونوں کی تاریخ خود ان ہی بادشاہوں کی دیوار پر رقم کردہ تحریروں، تصویروں، آثار قدیمہ کے کتبات اور ان کی بنائی ہوئی ممکنہ تعمیرات کے ذریعہ وجود میں آئی ہے، جن میں بادشاہوں نے اپنی عظمت کے گن گائے ہیں، ان کے صدیوں بعد آنے والے مؤرخین کے سامنے تاریخ کے نام پر یہی سرمایہ تھا، جسے انہوں نے اپنی تاریخی فہم کے نتیجہ میں ترتیب دیا، قدیم زبانوں کو سمجھنے کی کوششیں کی گئیں، اور ایک تاریخی تسلسل قائم کرنے کی کوشش کی گئی، یہ کوششیں کوئی شک نہیں قابل قدر تھیں، لیکن اتنی مختصر غیر مربوط معلومات کے ذریعہ مرتب تاریخ لکھی نہیں جاسکتی، پھر جب بعض بادشاہوں نے اپنے کارنامے خود ہی رقم کیے ہوں تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تحقیق کی میزان میں ان کا وزن کتنا ہوگا، بالخصوص رمسیس ثانی کی تاریخ کا تو نوے فیصد حصہ خود اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، گویا سیف وسنان کی نوک پر شاہی عظمت وقہر کے سایہ میں یہ تاریخ مرتب کی گئی، اس میں وہ پہلو جو اس کے ظلم وزیادتی پر مبنی ہیں، ممکن نہیں تھا کہ آجاتے، اس کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ اپنی شہرت اور اپنے تذکرہ کو زندہ جاوید بنانے میں بے حد دلچسپی رکھتا تھا، اور اس کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کرسکتا تھا۔ (الشرق: ۱/۲۲۷)

اپنے سڑسٹھ سالہ دور میں اس نے اس قدر عبادت گاہیں، محلات، یادگاری پتھر (جن میں اپنے کارنامے لکھے جاتے تھے) اور مجسمے بنوائے جس کی مثال پہلے اور بعد کے ادوار میں نہیں ملتی، خودنمائی کی خواہش اسے ایک نیا پایہ تخت مقرر کرنے کی طرف لے گئی، اس شہر کو اس نے خالی اپنے نام سے بسایا، اس نے اپنے لوگوں کو حکم دے رکھا تھا کہ جو بھی یادگار قائم کی جائے اس کا نام ہر جگہ نمایاں طور پر لکھا جائے، اپنی تشہیر کی خواہش اسے کثرت ازواج کی طرف بھی لے گئی، اسی لیے اس کے سو بیٹے اور ۵۹ بیٹیاں بتائی جاتی ہیں، کسی اور فرعون کے بارے میں یہ بات معلوم نہیں کہ اس کے اتنے بیٹے بیٹیاں تھیں، حکومت ملنے کے بعد اس کے توسیع پسندانہ عزائم کھل کر سامنے آئے، اس نے اپنے دشمنوں پر خاص طور سے حتیوں پر لگاتار حملے کیے، جس میں اسے کامیابی ملی، حتیوں کو وہ شہر قارش تک دھکیلنے میں کامیاب ہوا، یہاں تک کہ ان کو ذلت آمیز صلح پر مجبور ہونا پڑا، مصری تاریخ کے مطابق حتیوں نے ان الفاظ میں اپنے لیے پناہ چاہی:

”حتیوں کا سردار دربار فرعونی میں حاضر ہوکر یوں گویا ہوا: بادشاہ سلامت! کیا یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے غلام بندے بے دام یوں کچلے جائیں، اور آپ اپنے مبارک چہرے سے ان کو دیکھتے رہیں، اور ذرا بھی رحم نہ کھائیں، یاد کیجیے گذشتہ ایام میں آپ نے ہمارے کتنے لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا، کیا یہی سلسلہ آج بھی جاری رہے گا اور ہمارے تمام مردوں کا صفایا کردیا جائے گا؟ جہاں پناہ! اتنی سختی نہ کیجیے، امن وسلامتی جنگوں سے بہتر ہے“۔

اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو اس سے فرعون کا ظلم معلوم ہوتا ہے، اگر غلط ہے تو پھر اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ رمسیس ثانی میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا جذبہ کس حد تک پایا جاتا تھا، گرچہ حتیوں کی تاریخ میں اس کے برعکس بات کہی گئی ہے، انہوں نے معافی چاہنے یا امن وامان طلب کرنے کے واقعہ کا صاف انکار کیا ہے، بلکہ الٹے یہ بھی لکھا ہے کہ فرعون مقابلہ سے مایوس ہوکر واپس ہوا، اور انہوں نے فرعونی لشکر کے آخری حصہ کا تعاقب کیا۔ (۱/۲۳۲)

اس واقعہ سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، ہم نے تفصیل سے یہ واقعہ اس لیے لکھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ خود اس زمانہ میں بھی تاریخ اپنی خواہشات کے مطابق مرتب کی جاتی تھی، اس لیے کسی بادشاہ کی خامیوں یا ظلم وستم کے تذکرے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا، مصورین اپنی تصویروں کے ذریعہ تصویر کا ایک ہی رخ دکھانے پر مجبور تھے، ورنہ شاہی عتاب سے کسی بھی وقت ہلاک کیے جاسکتے تھے، بعد کے لوگوں نے ان ہی تحریروں اور تقریروں سے تاریخ مرتب کی، تعجب ہوتا ہے کہ شاہان مصر نے جو تاریخ مرتب کی اس میں بنی اسرائیل کا کہیں بھی تذکرہ نہیں ہے، چونکہ تاریخ کمزوروں کو گمنامی کے غار میں دھکیل دیتی ہے، اس لیے چار سو سالہ طویل قیام کے باوجود بنی اسرائیل کو فرعونی تاریخ میں چند سطروں کی بھی جگہ نہ مل سکی، بلکہ مؤرخین لکھتے ہیں کہ پوری فرعونی تاریخ میں بنی اسرائیل کا ذکر رمسیس ثانی کے بیٹے منفتاح کے حوالہ سے صرف اتنا آیا ہے: "أبید شعب الاسرائیلیین ولن یکون به بذر"، اسرائیلی قوم کو برباد کردیا گیا، اب پھر وہ دوبارہ اگ نہیں سکیں گے۔ (۱/۲۳۴)

اس تاریخ پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ طاقت اور طاقتوروں کی تاریخ ہے، جس میں کمزوروں کو نظر انداز کیا گیا، اور اس کے نتیجہ میں کئی سچے واقعات بھی تاریخ کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں میں پھنس کر رہ گئے، مزید غور کرنے پر یہ بھی اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ ایک جبری تاریخ ہے، جس میں شاہوں کے بدترین ظلم کو داب دیا گیا ہے اور عالیشان عمارتوں، فلک بوس اہراموں کے نیچے بے کسوں کی سسکیوں، آہوں اور کربناک چیخوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا ہے، فرعون اور اس کی فوج کے ڈوب مرنے کا تذکرہ بھی مصری تاریخ میں نہیں ہے، موجودہ مؤرخین تاریخ کے حوالہ سے اس واقعہ کا تذکرہ نہیں کرتے، چونکہ اس کی زد شاہان مصر کی قومی غیرت پر پڑتی ہے، اس لیے اس تاریخی عظیم الشان حیرت انگیز واقعہ کو بھی بحر قلزم میں ہمیشہ کے لیے ڈبو دیا گیا، قرآن کریم نے ان ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو پیش کیا، اس سے قبل توریت نے بھی اسے بیان کیا، لیکن ان کتابوں کو مذہبی کتابیں قرار دے کر ان کے بیان کردہ واقعات کا انکار کرنا موجودہ مؤرخین کی ایک نرالی ادا ہے، زمین کی تہہ سے کوئی پتھر یا تختی برآمد ہو اور اس میں کچھ آڑی ترچھی لکیریں بھی ہوں تو وہ ایک معتبر تاریخ ہے، جس کی معتبریت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے، اور ان آڑی ترچھی لکیروں کا جو بھی مطلب سمجھ لیا جائے وہ صحیح مستند تاریخ کا ایک حصہ ہے، لیکن ہزاروں سال پہلے کی مذہبی کتابوں میں جو بات بھی کہی جائے وہ تاریخی حوالہ سے غیر معتبر ہے، جس کا انکار کرنا تاریخی فرائض میں سے اولین فریضہ ہے، بعض مؤرخین کی اس ذہنیت نے خود تاریخ، تاریخی تسلسل اور تاریخی استناد کو بے حد نقصان پہنچایا ہے، قرآن کریم کی اعجاز بیانی کہ قربان جائیے کہ جب اس نے موسی وفرعون کا قصہ بیان کرنا چاہا تو تمہید یوں باندھی:

﴿طسم ☆ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ☆ نَتْلُوا عَلَيْكَ مِن نَّبَإِ مُوسَى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (القصص: ۱-۳)

(طسم، یہ کھلی ہوئی کتاب کی آیتیں ہیں، ہم تمہارے سامنے موسی وفرعون کا قصہ سچ سچ بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں)

لفظ "بالحق" یہ بتا رہا ہے کہ تاریخ میں موسی وفرعون کے قصہ کو چھپایا گیا ہے، اور جو بیان ہوا ہے اس میں بھی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، سچ سننا ہو تو ہم سے سنو، بہر حال جن فرعونوں کا تذکرہ موجودہ تاریخ کرتی ہے، ان میں فرعون موسی بننے کے لائق رمسیس ثانی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

بقیہ: سجدہ سہو کے احکام ومسائل

.....اور ظہر، عصر اور عشاء میں چھٹی رکعت تا کہ بعد کی دو رکعت نفل ہو جائیں، پھر آخر میں سجدہ سہو کرلے۔ (شامی: ۱/۵۵۳)

جہاں قعدۂ اولی بھول جانے کا تعلق ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر فرض نماز میں قعدۂ اولی بھول کر کھڑا ہونے لگا تو اگر فوراً ہی یاد آگیا جب کہ وہ قعود کے قریب ہی تھا تو اسے بیٹھ جانا چاہیے اور اس صورت میں اس پر سجدہ سہو بھی نہیں ہے، لیکن وہ اگر قیام کے قریب تھا تو اصل حکم یہ ہے کہ اب یاد آنے پر لوٹنے کی ضرورت نہیں ہے، نماز آگے جاری رکھے، اور آخر میں سجدہ سہو کرلے لیکن اگر نماز آگے جاری رکھنے کے بجائے قعدہ کے لیے لوٹ آیا تب بھی صحیح قول کے مطابق اس کی نماز ہو جائے گی، لیکن سجدہ سہو اس صورت میں بھی کرنا ہوگا۔ (شامی: ۱/۵۵۰، ہندیہ: ۱/۱۲۷)

اسلام حقوق نسواں کا علمبردار

محمد امین حسنی ندوی

عورتوں کے حقوق کو لے کر اسلام پر اعتراضات پہلے بھی کیے گئے ہیں، اور اب بھی کیے جارہے ہیں اور آئندہ بھی کیے جاتے رہیں گے، اس عنوان سے اسلام پر اعتراض کرنے والے یا تو وہ جاہل ہیں، جو نہ اسلام کی تعلیمات سے واقف ہیں اور نہ اسلام سے پہلے عورت کی حالت سے، یا دل کے وہ روگی ہیں جو جانتے تو سب کچھ ہیں لیکن حسد، کینہ اور عداوت نے ان کو جھوٹ بولنے پر مجبور کر رکھا ہے، یا پھر وہ بیچارے ہیں جو صرف سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں، یعنی بینا ہوتے ہوئے بھی نابینا بن جاتے ہیں، آیئے اب دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے توسط سے اسلام نے عورت کو کیا دیا۔

آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب معاشرہ میں عورت کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا تھا، سورہ نحل کی یہ آیت اس کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دیتی ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنثَى ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ، يَتَوَارَى مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَى هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ (النحل:۵۸،۵۹)

(جب انہیں میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو وہ اندوہناک ہو جاتا ہے اور اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ آیا ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے؟ دیکھو یہ جو تجویز کرتے ہیں بہت بُری ہے)

اسلام سے پہلے عرب معاشرہ میں جب کسی کا شوہر مرجاتا تو اس کے بیٹے اور رشتے دار اس کی بیوی کے وارث ہو جاتے، اگر وہ چاہتے تو کسی سے اس کی شادی کر دیتے اور اگر چاہتے تو اس کو شادی کرنے سے روک دیتے اور اس کو قید کر دیتے یہاں تک کہ وہ گھٹ گھٹ کر مرجاتی۔

قرآن کریم میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے حتی کہ ایمان، عمل جزاء وسزا میں بھی عورت اور مرد کو برابر رکھا گیا ہے:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ.....﴾

(الأحزاب: ۳۵)

(بے شک مسلمان مرد، اور مسلمان عورتیں، اہل ایمان مرد اور اہل ایمان عورتیں، اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، سچے اور کھرے مرد، اور سچی اور کھری عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور عظیم اجر کا انتظام فرما رکھا ہے)

دوسری جگہ ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الغافر:۴۰)

(جو بُرے کام کرے گا اس کو بدلا بھی ویسا ہی ملے گا اور جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان بھی ہوگا تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہاں ان کو بے شمار رزق ملے گا)

آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے دو بچیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو میں اور وہ اس طرح ہوں گے (آپ نے دو انگلیوں کو ملا کر بتایا) (مسلم)

آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس کی تین بیٹیاں ہوں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں ہوں یا دو بہنیں ہوں وہ ان کی اچھی تربیت کرتا ہو، اور ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہو، تو اس کے لیے جنت ہے“ (ترمذی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی تعلیم کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، آپ نے عورتوں کی تعلیم کے لیے ایک دن مخصوص کر رکھا تھا، اس دن وہ سب جمع ہوتیں اور آپ ان کو تعلیم دیتے۔ (مسلم)

آپ ﷺ نے عورتوں کے بارے میں فرمایا: استوصوا بالنساء خیراً ”سنو! عورتوں کے ساتھ اچھا معاملہ رکھو۔ (متفق علیہ)

نبی کریم ﷺ نے شوہروں کو بیویوں پر خرچ کرنے کی ترغیب

دی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم جو بھی اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہو اس پر تم کو ضرور اجر ملے گا یہاں تک کہ جو کچھ اپنی بیوی کے منھ میں رکھتے ہو تو اس پر بھی ثواب ملے گا''۔ (متفق علیہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں سے کہا کہ سب سے بہترین خرچ وہ خرچ ہے جو مرد اپنے اہل وعیال پر کرتا ہے "افضل دینار، دینار ینفقه الرجل علی عیاله" (سب سے بہتر اور مبارک رقم وہ ہے جو آدمی اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرے) (مسلم)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کی میزان عمل میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا وہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کا نیک عمل ہے (رواہ الطبرانی)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''شوہر جب اپنی بیوی کو پانی پلاتا ہے تو اس پر بھی اس کو ثواب ملے گا''۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ نے جب یہ حدیث سنی تو فوراً پانی کی طرف لپکے پانی لے کر اپنی اہلیہ کے پاس آئے، پانی پلایا اور پھر ان کو یہ حدیث بیان کی جو آپ ﷺ سے سنی تھی۔ (احمد)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہو۔'' (احمد وترمذی)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے خود سیتے تھے، اپنی چپل خود ٹانکتے تھے، اور جس طرح دوسرے لوگ اپنے گھروں کے کام کرتے ہیں اسی طرح آپ بھی گھر کے کام کیا کرتے تھے۔ (مسند احمد)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''شوہر کو بیوی سے کسی بات پر ناراض نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ اگر اس کو بیوی کی ایک بات بری لگے گی تو ضرور دوسری کوئی بات اس کو اچھی بھی لگے گی''۔ (مسلم)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ میں سب سے زیادہ دو کمزوروں کے حق کی تاکید کرتا ہوں اور اس کو اہم قرار دیتا ہوں یتیم اور عورت''۔

آپ ﷺ نے بغیر اطلاع کے رات میں گھر جانے سے منع کیا۔

حضرت اسودؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حضور ﷺ کا اپنی بیویوں کے ساتھ کیا رویہ رہتا تھا؟ انہوں نے کہا: کہ نبی کریم ﷺ گھر کے کاموں میں ان کی مدد فرماتے، نرمی ومحبت سے گفتگو کرتے، ہر طرح ان کے آرام، ان کی راحت اور ان کی خوشی کا خیال فرماتے تھے۔

آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: ''میں سمجھ جاتا ہوں کہ کب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور کب ناراض، انہوں نے کہا، وہ کیسے اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا کہ جب تم خوش ہوتی ہو تو کہتی ہو کہ محمد کے رب کی قسم، اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو کہ ابراہیم علیہ السلام کے رب کی قسم، حضرت عائشہ نے کہا! آپ نے صحیح فرمایا: اے اللہ کے رسول میرے دل سے آپ کی محبت کبھی ختم نہیں ہو سکتی''۔

بقیہ: دعوت وتبلیغ کے تقاضے.....

.....ہمیں شرح صدر ہو، قوت ہو، ثقہ حاصل ہو، خود اس پر مطمئن ہوں، ثقل بالنفس ہو۔

دوسری بات ہے: ''وعی المخاطب'' یعنی مخاطب سے آپ واقف ہوں، آپ کس سے بات کر رہے ہیں، ایک جاہل سے بات کر رہے ہیں، ایک پڑھے لکھے سے بات کر رہے ہیں، ایک دشمن سے بات کر رہے ہیں، ایک ہمدرد سے بات کر رہے ہیں، اس سے واقف ہونا بھی ضروری ہے کہ آپ اس کی زبان ومزاج سے واقف ہوں، تیسری چیز ہے: ''اسلوب الدعوۃ'' قرآن میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ ہمارا اسلوب کیسا ہونا چاہیے، اسلوب معاندانہ نہ ہو، بلکہ دلوں پر اثر ڈالنے والا ہو، مخاطب کا احترام ہو، سیرت میں اس کے بہت سے واقعات ملیں گے کہ حضور ﷺ کے پاس کیسے کیسے دشمن آئے، اور وہ گئے تو وہی ابغض الناس احب الناس میں تبدیل ہو گئے، تو اسلوب الدعوہ دلوں پر اثر ڈالنے والا ہو، محض عقلی دلائل کافی نہیں ہیں، چوتھی چیز ہے: ''امتزاج الناس'' لوگوں سے ملنا جلنا، مختلف جگہوں پر جانا، اور مختلف موقعوں پر اس سے فائدہ اٹھانا، اس وقت جو بہت سے مسیحی تبشیری دعوتی کام کر رہے ہیں، ان کے یہاں اس کا خاص طور پر ذکر ہے کہ مختلف موقعوں پر بغیر دعوت کے چلے جاؤ، خوشی یا غمی کا موقع ہے، کہیں لوگ جمع ہو رہے ہیں، اور وہاں جا کر ان کو مانوس کرنے کے لیے کوئی اچھی بات کہہ دو، جس کا ان کی طبیعت پر اثر پڑے۔ یہ سب چیزیں دعوت کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

اللہ کی محبت

محمد ارمغان بدایونی ندوی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِيْ؟ اَلْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِيْ ظِلِّيْ، يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّيْ. (صحیح مسلم: ٦٥٤٨)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا میری عظمت و بڑائی کی وجہ سے جو آپس میں محبت کرتے تھے وہ کہاں ہیں، آج میں ان پر اپنا سایہ کروں گا، آج میرے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں۔

فائدہ:- اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں طبعی طور پر محبت کا عنصر رکھا ہے، لیکن اس محبت کا محل کیا ہو؟ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے عقل کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے، تاکہ انسان عقل کی مدد سے اس اہم وحساس عنصر کو صحیح محل پر لگا سکے، محبت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے لیے سخت سے سخت مراحل کو نہایت آسان بنا دیتی ہے، ہر مشکل اس کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے، اگر یہ محبت کسی انسان سے ہو تو اس کی ہر نقل وحرکت حد درجہ محبوب ہو جاتی ہے، اس کی اتباع میں جی لگنے لگتا ہے، اگر یہی محبت کسی مادی چیز سے ہو جس سے دنیوی منافع کا حصول وابستہ ہو، تو انسان اسی کی تگ ودو میں رہتا ہے، پھر اس کی محبت کے آگے وہ اپنی عزیز سے عزیز چیز کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔

قرآن مجید اور احادیث نبوی ﷺ میں متعدد جگہوں پر اہل ایمان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ محبت صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے ہونی چاہیے، ایک جگہ اہل ایمان کا شعار بتاتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرۃ: ١٦٥) (اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والے ہیں) یہ عقل کا تقاضا بھی ہے کہ اصل محبت اللہ سے کی جائے، کیونکہ وہی ذات واحد ہے جس کے احسان اور نعمتوں کا حق کوئی انسان ادا نہیں کر سکتا، وہی سب کا خالق و مالک اور رازق ہے، اور سب کو ان کے اعمال کی جزا دینے والا ہے۔

محبت الٰہی کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے لیے دینی امور پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، اگر محبت کا جذبہ موجود ہو تو دینی اعمال اندرون کے جذبہ سے ادا ہوتے ہیں، اور جس درجہ اس میں کمی واقع ہوتی ہے، اسی درجہ باطنی کیفیات کا فقدان ہوتا ہے، اگر دل میں محبت الٰہی کا جذبہ موجزن ہے تو پھر گرمی کا روزہ ہو یا سردی کی نماز، یا کثیر مال کی زکاۃ نکالنے کا مسئلہ ہو، یا بیت اللہ کا حج ہو، ایک صاحب ایمان کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے، بلکہ یہ تمام اعمال اس کی طبیعت کو مزید منشرح کرنے والے ہیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کا اعلیٰ معیار ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے خدا کی محبت کے سامنے ہر چیز بے مایہ تھی، یہی وہ جوہر تھا جس کی بنا پر وہ خدا کے لیے ریگستان کی تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے، ظالموں کی کڑوی کسیلی سنتے، ان کے اوپر گندگیاں پھینکی جاتیں، مختلف قسم سے زدوکوب کیا جاتا، مگر ان کے ایمان میں ذرہ برابر بھی لغزش نہ آتی، کیونکہ ان کو محبت کا وہ اکسیر مل چکا تھا جس کے بعد ہر مصیبت اور سختی بے حیثیت ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا ایک بڑا سبب خدا سے محبت کا فقدان بھی ہے، اس وقت اکثریت ایسی ہے جس کے دل محبت خدا سے معمور نہیں ہیں، ان کی محبت کا محور فلمی اداکار ہیں یا دنیا کی زرق برق میں وہ مست ہیں، آخرت کی انہیں کوئی فکر نہیں، بحیثیت حقیقی رب کے ان کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اصل محبت کی مستحق ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر طرف بیداری کا نعرہ لگایا جا رہا ہے، ہر سطح پر اصلاح معاشرہ کی کوششیں ہو رہی ہیں، مگر ان کا وہ خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آ رہا ہے جس کا مطالبہ ہے، کیونکہ آج مسلم اکثریت کے دلوں کی توجہ کا مرکز ایسے لوگوں کی محبت ہو گئی ہے جو بجائے خود قابل رحم ہیں۔

محبت کے سلسلہ میں حدیث بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کا اصل محل خدا ہے، اگر دنیا میں بھی کسی سے محبت کی جائے تو اسی کے لیے، کسی سے غصہ ہو تو اسی کے لیے، غرض کہ جو بھی کام ہو ہر کام میں اس کی محبت کا عنصر شامل ہو، تو قیامت کے دن جب کہ کوئی سایہ نہ ہوگا خدا تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس وقت سایہ عطا فرمائے گا۔

حضرت ابو بصیرؓ کا اسوہ

ابوالعباس خاں

ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کررہے ہیں۔ یہ خواب سنتے ہی صحابہ کرام کے دلوں میں بیت اللہ کی محبت اور شوق کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی، اگرچہ مکہ کی تپتی وسلگتی ریت میں انھیں تڑپایا گیا تھا، سخت سے سخت اذیتیں دی گئیں تھیں، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا تھا لیکن خانہ کعبہ کی محبت ان کے دل میں اک پھانس کی طرح چبھی ہوئی تھی، جس سے فرقت ومجبوری کے جذبات رِسا کرتے تھے۔

تقریباً چودہ سو جاں نثار آقائے مدنی کی ہمراہ روانہ ہوئے، منزل مکہ مکرمہ تھی اور مقصد صرف بیت اللہ کی زیارت اور عمرہ تھا، کوئی ہتھیار پاس میں نہ تھا سوائے اس تلوار کے جو سفر کا لازمی حصہ تھی، اور وہ بھی نیام میں، قربانی کے جانور ساتھ تھے، گلے میں نعل پڑے تھے جو قربانی کی علامت تھی۔

قریش مکہ کو خبر ہوئی، وہ جوش جنگ سے بھر گئے، سمجھے کہ جنگ یقینی ہے، سرگرمیاں بڑھ گئیں، کچھ چھیڑ چھاڑ بھی شروع ہوئی، لیکن نبی رحمت ﷺ نے کہلا بھیجا کہ جنگوں نے قریش کی حالت تباہ کر رکھی ہے، اب بہتر ہوگا کہ کچھ مدت کے لیے صلح کرلیں، اگر یہ منظور نہیں تو میں آخری سانس تک جنگ کے لیے تیار ہوں۔ قریش کے ہوش مندوں ودانشوروں نے اسی میں عافیت سمجھی اور گفت وشنید کے بعد صلح منظور ہوئی۔

سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ تھا، صلح کی دفعات مرتب ہونے لگیں، ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ مکہ کا کوئی مسلمان اپنے ولی کی مرضی کے بغیر آنحضور ﷺ کے پاس آئے گا تو واپس کردیا جائے گا، لیکن مدینہ سے کوئی مکہ کو آئے گا تو واپس نہیں کیا جائے گا۔ یہ دفعہ کھلے طور پر زیادتی اور من مانی تھی، اتفاق کی بات صلح نامہ مرتب ہو ہی رہا تھا کہ خود سہیل بن عمرو کے فرزند ابوجندلؓ وہاں آپہنچے، پاؤں میں بیڑیاں، بدن پر زخموں کے نشان، لڑکھڑاتے سنبھلتے صحابہ کے سامنے گر پڑے، مدتوں سے قریش کی قید میں تھے اور اپنے اسلام کی قیمت چکا رہے تھے۔ سہیل نے کہا کہ صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے، انھیں ہمارے حوالہ کردو۔ نبی ﷺ نے کہا کہ ابھی صلح مکمل نہیں ہوئی، انھیں یہیں رہنے دو، سہیل نے ایک نہ مانی، آپ ﷺ نے کئی دفعہ اصرار کیا تو اس نے کہا کہ پھر ہمیں صلح منظور نہیں، مجبوراً نبی کریم ﷺ کو اس کی بات ماننی پڑی اور ابوجندلؓ کے ان کے حوالہ کردیا گیا۔

قریش کی قید سے بچنا آسان نہ تھا، ابوجندلؓ جان پر کھیل کر آئے تھے، زخموں سے چور بچتے بھاگتے نڈھال تھے، درد وکرب کے ساتھ پکار اٹھے کہ اے مسلمانو! میرے زخموں کو دیکھو، میری حالت کو دیکھو، کیا تم مجھے اسی حال میں دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تم پھر مجھے کافروں کے حوالہ کرتے ہو؟! مسلمان تڑپ اٹھے، تلواریں کھنچ ہی جاتیں، خون کی ندیاں بہہ ہی جاتیں لیکن معاہدہ ہوچکا تھا، مسلمانوں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ یہ صلح ہر حال میں ضروری تھی، یہ ایک انقلاب انگیز صلح تھی، فتح مکہ کا پیش خیمہ اور عالمی فتوحات کا دیباچہ تھی۔

ابوجندلؓ کو بیڑیوں میں جکڑا گیا، وہ چیختے چلاتے رہے لیکن ان کی آواز حدیبیہ کی وادی میں گونج کر خاموش ہوگئی، سسکیوں اور ہچکیوں کی سوغات لیے بوجھل قدموں کے ساتھ وہ مکہ کو روانہ ہوئے، دماغ میں مکہ کا قید خانہ گردش کرنے لگا، وہاں کی سختیاں نگاہوں میں گھومنے لگیں، بالآخر ایمانی قوت نے بدن میں حرارت پیدا کردی، وہ موقع کی تلاش میں رہے، سفر لمبا اور راستہ پر پیچ تھا، اتفاق کی بات کفار کی گرفت کچھ ڈھیلی ہوئی اور ابوجندلؓ نے اپنا پیدائشی حق حاصل کیا اور آزاد فضاؤں میں اہل مکہ واہل مدینہ کی گرفت سے روپوش ہوگئے۔

صلح حدیبیہ کو ابھی چند دن بھی نہ گذرے تھے کہ مکہ کا قید خانہ ایک بار پھر ٹوٹا، اور ایک نئے قیدی نے آزاد فضاؤں میں سانسیں لینے کا اعلان کردیا، یہ صحابی حضرت ابوبصیرؓ تھے، آزاد ہوتے ہی وہ مدینہ منورہ پہنچے اور رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مشرکین مکہ کو خبر ہوئی، فوراً اپنے ہرکارے دوڑائے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو حدیبیہ کا معاہدہ یاد دلایا، اور ابوبصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

ابوبصیر لرز اٹھے، یہ کیسا مطالبہ ہے؟! یہاں پناہ نہیں ملے گی تو

کہاں ملے گی، مسلمان سہارا نہیں دیں گے تو کون دے گا؟! بے شک ابوبصیر کمزور نہیں تھے، وہ کفار کی سختیوں سے ٹوٹے نہیں تھے، انھیں معلوم تھا کہ اسلام کی قیمت ہر حال میں چکانی ہے، لیکن وہ ایمان کا سودا نہیں کر سکتے تھے، کفار ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے، انھوں نے لجاجت سے کہا، ساری امیدوں کے ساتھ کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ مجھے ان مشرکین کے پاس بھیجتے ہیں جو مجھے دین سے پھیرنا چاہتے ہیں۔''

ایک بار پھر مسلمانوں کا وجود تڑپ اٹھا، ایک بار پھر تلواریں نیاموں سے نکلنے کو مچل اٹھیں، ایک بار پھر ضبط و برداشت کی ساری حدیں مٹنے کو بے تاب ہوگئیں، لیکن رسول کا فرمان سب سے اونچا ہے، اس کے سامنے ساری خواہشیں، آرزوئیں، تمنائیں اور سارے تقاضے خس وخاشاک سے بھی کمتر ہیں۔ معاہدہ کی پابندی کی گئی، ابوبصیر کو مشرکوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور صحابہ کرام اپنے بھائی کی مظلومیت، اس کی بے بسی ولاچارگی پر خاموش خدا سے فریادی رہے۔

مشرکین ابوبصیر کو لے کر روانہ ہوئے، وہ صرف دو ہی تھے، راستہ میں پڑاو ڈالا، ابوبصیرؓ نے ایک سے کہا تمہاری تلوار بہت عمدہ معلوم ہوتی ہے، یقیناً یہ بہت قیمتی ہوگی، تم نے بڑے جوہر دکھائے ہوگے، اپنی تعریف سن کر وہ شیخی میں آگیا، تلوار لہراتے ہوئے کہا کہ خدا کی قسم کی یہ بہت ہی عمدہ تلوار ہے، میں نے بارہا اس کو آزمایا ہے۔ ابوبصیر نے کہا کہ ذرا مجھ کو بھی دکھلاو۔ انجام سے غافل، اپنی بدبختیوں سے بے پروہ اس شخص نے تلوار ابوبصیر کو تھمادی اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ تلوار آسمان میں چمکی، اور چشم زدن میں اس مشرک کا کام تمام کر گئی۔ یہ منظر دیکھ کر دوسرا شخص ہواس باختہ ہوگیا، جان بچا کر بھاگا اور سیدھے مدینہ پہنچ کر دم لیا، رسول اللہ ﷺ سے ماجرا بیان کرتے ہوئے کہا کہ حضور! میرا ساتھی تو مارا گیا، اب میری باری ہے، خدارا مجھے بچالیجیے۔ پیچھے ابوبصیر بھی آپہنچے، عرض کیا: حضور! آپ نے مجھے واپس کر دیا تھا، آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا، میرا ان سے کوئی معاہدہ نہیں، اب میں آزاد ہوں، بالکل آزاد!

مکہ میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، نت نئی زیادتیاں روا تھیں، رسیوں میں باندھے جاتے، گلیوں میں گھسیٹے جاتے، پتھر مارے جاتے، سر پھوڑے جاتے، تپتی ریت پر رگڑے جاتے، بھاری پتھروں سے دبائے جاتے، وہ صرف اللہ اللہ کرتے اور پڑے رہتے، کوئی سہارا نہ تھا، مکہ میں جینا مشکل تھا، اور مدینہ کی راہوں کو معاہدہ کی شرطوں نے مسدود کر رکھا تھا، لیکن جلد ہی انھیں یہ خوش کن خبر بھی پہنچ گئی کہ بیکس وستم رسیدہ لوگوں کے لیے ابوبصیر ایک مضبوط پشت پناہ ہیں۔

ابوبصیرؓ نے ساحل سمندر پہ پناہ لی، جلد ہی ابوجندل بھی ان کے پاس آپہنچے، ایک دوسرے کا سہارا بن گئے، اور پھر ایک سلسلہ شروع ہوا مکہ کے قید خانوں کے ٹوٹنے کا، کبھی ایک تو کبھی دو اور کبھی کئی کئی مسلم قیدی فرار ہوتے، مشرکین مکہ سے بچتے بچاتے ابوبصیرؓ کی پناہ میں آجاتے، اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ستر لوگوں کی ایک مضبوط جمعیت تیار ہوگئی۔

ساحل سمندر سے اہل مکہ کے تجارتی قافلے گذرا کرتے تھے، تجارت کے منافع کو مسلمانوں کے خلاف بھی استعمال کیا جاتا تھا، ابوبصیر اور ان کے ساتھی ان قافلوں کو روکتے، ان کے مال واسباب پر قبضہ کرتے اور ضرورت پڑنے پر انھیں سبق بھی سکھاتے۔

چند ہی دنوں میں اہل مکہ کے ہوش ٹھکانے لگے وہ خود آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، کہنے لگے کہ ہم اپنی شرطوں سے باز آئے، آپ انھیں اپنے پاس بلا لیجیے، معاہدہ کی اس شرط کو ہم خود خارج کرتے ہیں، اب مکہ کا کوئی بھی مسلمان آپ کے پاس آنا چاہے تو اسے پورا اختیار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خط لکھ کر اپنا قاصد روانہ کیا، ابوبصیرؓ کی زندگی کے آخری لمحات تھے، نامۂ مبارک کو اپنے سینہ سے لگایا اور دار فانی سے رخصت ہوگئے، باقی اصحاب مدینہ منورہ کو آگئے۔

بلاشبہ سیرت نبویؐ کا ہر پہلو ایک مکمل اسوہ ہے، صحابہ کرام کی زندگی کا ہر گوشہ قابل تقلید ہے، حضرت ابوبصیر کا طریقہ بھی آج وقت کی ایک اہم ضرورت اور ایک ناگزیر اسوہ ہے! ہم یہ نہیں کہتے کہ سبھی مسلمان حضرت ابوبصیر کو اپنے لیے اسوہ بنالیں، لیکن ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو حضرت ابوبصیرؓ کے مٹتے ہوئے اسوہ کو زندہ رکھے، جو مظلوم مسلمانوں کے لیے مضبوط پشت پناہ ہو، جو ظالموں کو ان کے مظالم کی سنگینی سے آشنا کرا کر امن کی فضا قائم کر سکے!

محدثین کا استغنا اور بے نیازی

مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ

حضرات محدثین میں استغنا اور بے نیازی حد درجہ تھی، اور ہمیشہ ان حضرات نے امراء وارکان دولت کے مال اور ان کی توجہ سے بیازی برتی۔

حضرت سعید بن المسیبؒ کی خدمت میں ایک بار خلافت کی جانب سے تیس ہزار درہم کی رقم پیش کی گئی تو حضرت سعیدؒ نے بڑی توجہی سے فرمایا: مجھ کو نہ تو بنی امیہ کی پرواہ ہے، اور نہ ان کے مال و دولت کی، میں خدا کے سامنے جاؤں گا وہ میرا اور ان کا انصاف کرے گا۔

حضرت سفیان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبد الملک کا ایک بیٹا آیا اور حضرت طاؤس کے پہلو میں بیٹھ گیا، لیکن طاؤس ادھر متوجہ نہ ہوئے، ان سے کسی نے کہا کہ آپ کے پاس امیر المومنین کے صاحبزادے بیٹھے ہیں اور آپ متوجہ نہیں ہوئے، حضرت طاؤس نے فرمایا کہ میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ اس کو علم ہو جائے کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو اس چیز سے بے نیاز ہیں جو اس کے پاس ہیں۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملکؒ کعبہ میں داخل ہوا، اتفاق سے سامنے حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر پڑ گئے، ہشام نے حضرت سالم سے کہا کہ مجھ سے جو کچھ مانگنا ہو مانگ لیجئے، حضرت سالم نے جواب دیا کہ خدا کے گھر میں خدا کے علاوہ کسی اور سے مانگنا باعث شرم ہے، تھوڑی دیر بعد ہشام باہر آیا اور حضرت سالم سے پھر بولا: اب تو مانگئے میں باہر آ گیا ہوں، حضرت سالم نے فرمایا: دنیا کی حاجت یا آخرت کی نعمت؟ ہشام بولا: دنیاوی چیز، حضرت سالم نے فرمایا: دنیا کی حاجت اس سے تو نہ مانگی جو اس کا مالک ہے، اس سے کیسے مانگوں جس کے قبضہ میں کچھ نہیں۔

ایک بار خلیفہ مہدی نے سفر حج کے موقع پر اپنے حاجب ربیع کے ذریعہ تین ہزار دینار امام مالک کی خدمت میں بھیجے، دوسرے دن قاصد کی زبانی کہلایا کہ آپ میرے ساتھ بغداد تشریف لے چلیں، امام مالک نے قاصد سے فرمایا: اشرفیوں کی تھیلیاں اسی طرح رکھی ہیں لے جا سکتے ہیں، لیکن امام مالکؒ مدینہ نہیں چھوڑ سکتا، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے: "المدینة خیر لهم لو کانوا یعلمون"

امام احمدؒ، مامون، معتصم اور واثق کے ہاتھوں ایک عرصہ تک مصیبت اور تکلیفوں کا شکار ہوتے رہے، ان کے بعد متوکل کا رویہ نرم ہو گیا، اور ایک عرصہ کے بعد شدائد و اذیتوں سے نجات ملی، اسی متوکل کا واقعہ ہے کہ ایک بار اس نے امام احمدؒ کی خدمت میں ایک ایسی بھاری تھیلی بھیجی جو خچر پر لائی گئی، امام نے صاف کہہ دیا کہ مجھ کو اس کی حاجت نہیں، لانے والے نے عرض کیا: حضرت! آپ اس کو واپس نہ کریں، خلیفہ کا دل بڑی مشکل سے آپ کی طرف سے صاف ہوا ہے، اس کو پھر بدگمانی پیدا ہو جائے گی، امام موصوف نے تھیلی ایک کونہ میں ڈلوا دی، آدھی رات کو اپنے چچا کو بلوایا اور فرمایا: مجھ کو اس تھیلی کی وجہ سے رات کو نیند نہیں آ رہی ہے، میں یہ لے کر بڑا پریشان اور پشیماں ہوا ہوں، وہ بولے اس وقت آدھی رات ہے، تمام لوگ غافل سو رہے ہیں، صبح آپ جیسا سمجھئے گا کیجئے گا، صبح ہوتے ہی امام احمدؒ نے معتمد اور واقف کاروں کو بلا کر صالح اور مستور الحال مستحقین کی فہرست بنوائی اور سارا مال تقسیم فرما دیا، یہاں تک کہ وہ تھیلی جس میں رقم آئی تھی ایک مسکین کو دے دی۔

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP -19

Volume: 09 | AUGUST 2017 | Issue: 08

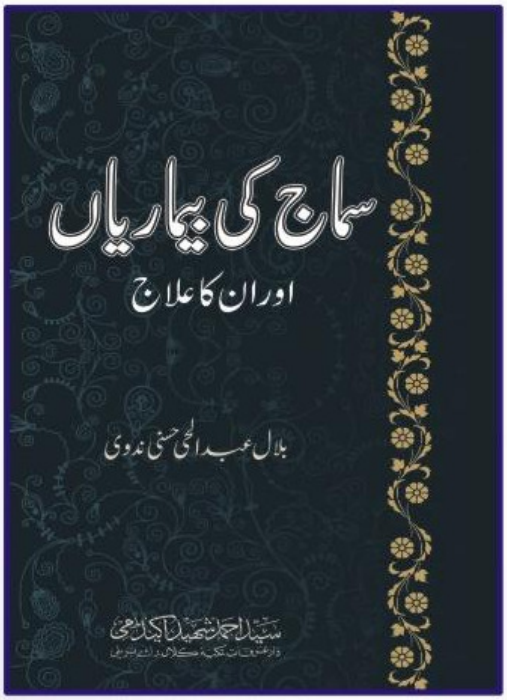

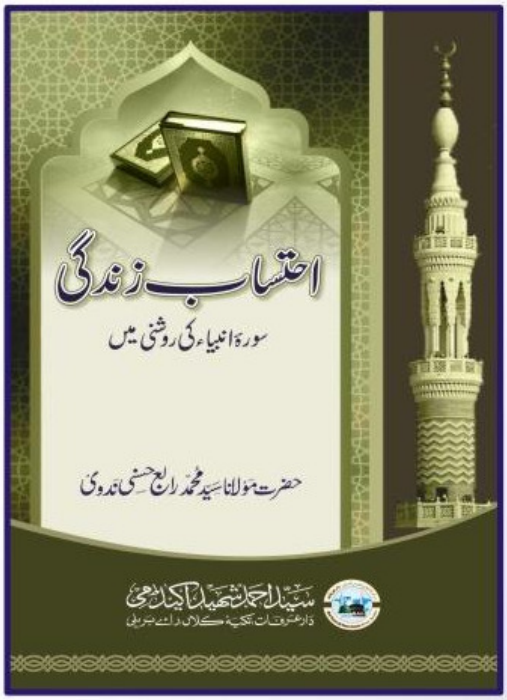

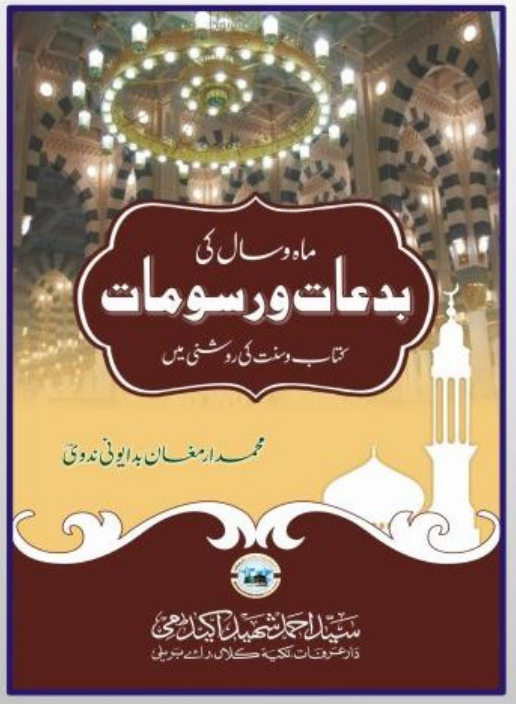

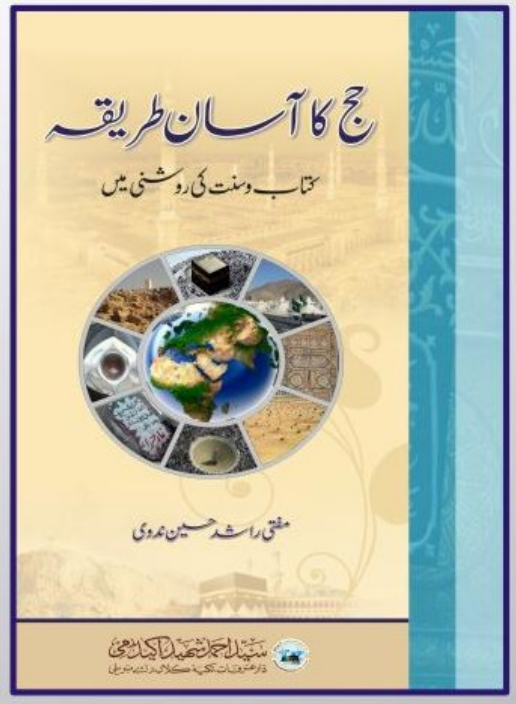

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)